حاشئے

فراق گورکھپوری

سنگم پبلشنگ ہاؤس
۸/۴ بنک روڈ۔ الہ آباد

مضامین

صفحہ

رابندر ناتھ ٹیگور . . . . . سنہ ۱۹۱۹ء ۱

ایک سوال کے کئی جواب . . سنہ ۱۹۴۷ء ۳۷

ہم نے یہ جانا کہ . . . . . سنہ ۱۹۳۹ء ۶۱

عشقیہ شاعری کی پرکھ . . سنہ ۱۹۴۵ء ۹۶

چوں نہ دیدند حقیقت . . . . سنہ ۱۹۴۲ء ۹۳

غالب پھر اس دنیا میں . . . . سنہ ۱۹۴۰ء ۱۰۵

فراقؔ گورکھپوری کی دوسری کتابیں

رُوپ

(سنگارس کی رُباعیاں) جمالیاتی شاعری کا لافانی شاہکار
کئی تصویروں کے ساتھ۔ فی جلد پانچ روپیہ آٹھ آنہ۔

شبنمستان

غزلوں کا مجموعہ ۵۱۲ صفحات۔ اگر دُنیا فراق کو بھلا دے گی
تو میرؔ۔ غالبؔ۔ اقبالؔ کسی کو یاد نہ رکھ سکے گی۔ شبنمستان بیسویں
صدی کی غزلگوئی کا بلند ترین اور اہم ترین مجموعہ ہے۔ فی جلد
چھ روپیہ۔

رَمز و کنایات

غزلوں کا دوسرا مجموعہ ۳۰۴ صفحات۔ فراقؔ کا تغزل تفریح
زندگی نہیں ہے بلکہ زندگی ہے۔ فی جلد تین روپیہ آٹھ آنہ۔

رنگ و نور

اس مجموعہ میں فراق کے وہ عشقیہ اشعار جمع کر دئے گئے ہیں جنھوں نے فراق کی شہرت کو اَمر بنا دیا ہے۔ فی جلد دو روپیہ بارہ آنہ۔

رُوحِ کائنات

نظموں کا مجموعہ جس میں اُردو کی بلند ترین عشقیہ نظم شام عبادت بھی شامل ہے۔ اب بہت کمیاب ہے ۔ فی جلد چار روپیہ آٹھ آنہ۔

اُردو کی عشقیہ شاعری

یہ مقالہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر جملہ گہرے سوچ میں ڈال دیتا ہے۔ فی جلد دو روپیہ بارہ آنہ۔

از سردار بلونت سنگھ

ہندوستان ہمارا

(افسانے) جگا، سنہرا دیس، خدا کی وصیت، اُجلے پھول،

شیرازہ، تار پود کے مصنف بلونت سنگھ کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ۔ ہر افسانہ میں ڈوب کر جب آپ اُبھریں گے تو اپنے اندر نئی زندگی محسوس کریں گے۔ فی جلد تین ۳ روپیہ آٹھ آنہ۔

از مجنوں گورکھپوری

اقبال

(اجمالی تبصرہ) اقبال کی شاعری کے ہر پہلو کو سمجھنے کے لئے بہترین کتاب۔ فی جلد ایک روپیہ بارہ آنہ۔

مریم مجدلین

(ناٹک) مائٹرلنگ کا یہ ناٹک کروڑوں آدمیوں کو اچھے معنوں میں دیوانہ بنا چکا ہے۔ مجنوں کے ترجمے میں اصل کتاب کا جیتا جاگتا جادو نظر آتا ہے۔ فی جلد دو ۲ روپیہ بارہ آنہ۔

(ہماری دوسری کتابوں کی فہرست کتاب کے آخر میں)

سنگم پبلشنگ ہاؤس
۵۸ بنک روڈ۔ الہ آباد

انتساب

مَیں یہ کتاب معنون کرتا ہوں اُن تمام افراد کے نام جن کی دلی تمنّا ہے کہ جس طرح انگلستان، امریکہ، فرانس، ناروے، ڈنمارک، رُوس، ایران، عرب، چین، جاپان اور تمام ملکوں کے ادب وہاں کی زندگی کو آئینہ دکھاتے ہیں جس طرح سنسکرت ادب، بنگالی ادب اور ہندوستان کی متعدد زبانوں کے ادب یہاں کی زندگی کی داخلی اور خارجی مصوّری کرتے ہیں اسی طرح اُردو ادب بھی ہندوستان کی زندگی کا لہراتا ہوا آئینہ ہو۔

فراقؔ

رابندر ناتھ ٹیگور

گیتانجلی کی مدحیہ تنقیدوں کو پڑھ کر ہندوستانیوں کو اہل مغرب میں ایک خاص رُجحان کا پتا چلتا ہے۔ اہل مغرب کا مذہبی مزاج اور میلان جو صدیوں کی عیسائی تہذیب و ترتیب کا نتیجہ ہے ان کو ایک ایسے خُدا کی عبادت و پرستش پر مائل کرتا ہے جو حقیقت میں اُن سے جُدا ہے۔ اور اس لئے ٹیگور کی وہ نظمیں جن کا نفس مطلب خُدا اور انسان کی ہستیوں کا تفرقہ ہے۔ اہل مغرب کے مذاق کو زیادہ مرغوب ہوتی ہیں۔ ہمارے شاعر کے عاشقانہ گیتوں میں۔ اس تفرقہ کا راگ اکثر سنائی دے جاتا ہے لیکن ٹیگور کو عشق یا بھگتی کے خاص کیفیت کا شاعر تصوّر کرنا اُن کی ہمہ گیری اور کمال کی بہت محدود اور ایک طرفہ داد دیتا ہے۔ ایسی غلط فہمیوں سے بچنے اور ٹیگور کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ٹیگور کی

بہت سی خصوصیات میں سے چند خصوصیات جان لی جائیں تب ہم کو ایک ایسی کلید مل جائے گی جس سے ہم کلام ٹیگور کے اُن تضاد اور ایک دوسرے سے بظاہر برعکس تخیلات کو بخوبی سمجھ جائیں گے۔

ربندر ناتھ ٹیگور کے تخیل کی وسعت و جولانی محتاج بیان نہیں وہ ہر طرح کے انسانوں اور انسان کے مختلف جذبات کی کیفیتوں کو ایسا اپنا لیتے ہیں۔ اور اُن میں شاعرانہ جوش و خروش و بیگانگی اس طرح کوٹ کوٹ کے بھر دیتے ہیں۔ گویا وہ اُنھیں کا حصہ ہے۔ اُن کا ہمہ گیر تخیل نہایت کامیابی سے اپنے اور عورتوں کے خاص جذبات بھی طاری کر لیتا ہے اور خاص خاص موقعوں پر وہ اپنی بجنسہ وہی حالت کر لیتے ہیں۔ جو ایک خاص عورت کی ایسے وقت میں ہوگی۔ عورتوں کی مزاج شناسی اور اُن کے جذبات کے اظہار کا ٹیگور کو خاص ملکہ ہے اور اُس کا پتہ اُن کے ناولوں اور ڈراموں سے صاف صاف چل جاتا ہے۔ جن میں عورتوں کے جذبات کی مصوّری کرتے ہوئے وہ نسوانی فطرت کے تہ کو پہونچ گئے ہیں۔ وہ ہم کو طرز

معاشرت وطریق زندگی کے وہ مختلف نمونے جو ہندوستان کی کثیر التعداد آبادی میں نظر آتے ہیں۔ اس طرح دکھلاتے ہیں گویا اپنی ہی سرگذشت سُنا رہے ہیں ان کا تخیّل فطرت انسانی پر اتنا حاوی ہے اور ان کی شاعری اصلیت میں اس قدر ڈوبی ہوتی ہے گویا انھوں نے اپنی شخصیت کو ان لوگوں کی شخصیتوں میں تحلیل کر دی ہے جن کا بیان ان کی تصنیفات میں ہے۔ گویا اپنی ہستی اُن لوگوں کی ہستیوں پر قربان کر دی ہے۔ یہ بات ان لوگوں کو جو ربندر ناتھ کے سوانح حالات سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں، ذرا تعجب انگیز معلوم ہو گی۔ ربندر ناتھ کی عمر کا بہت بڑا حصہ ایک نہایت محدود دائرہ میں گزرا ہے۔ وہ عوام الناس سے اس قدر دور رکھے گئے تھے کہ ان کے اعلیٰ درجے کے مردم شناس ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی مگر ان کی نظر اُن سے کہیں زیادہ وسیع اور ان کی جذبہ شناسی اور ہمدردی اس سے کہیں زیادہ عام اور ہمہ گیر ہے جو اس علٰحدگی کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔ ان کی تصنیفات پڑھتے وقت وہ

تفرقہ جو مشرق اور مغرب کے درمیان غار ہائے عمیق کی طرح حائل نظر آتے ہیں ہم کو مٹتے ہوئے اور ملتے ہوئے محسوس ہونے لگتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس خاص رمز یا کسی ایسے اصول کو پا گئے ہیں جو مختلف اقوام اور مختلف تہذیب کے لوگوں کے جذبات اور کیفیات میں شامل ہیں اور وہ وحدت اور معرفت کی بلند چٹان پر بیٹھ کر ایسا دلکش نغمہ چھیڑتے ہیں جو بنی نوع انسان کو مسخر کر لیتا ہے۔ کتنے ہی اعلیٰ درجہ کی تہذیب ہو اس کی تہ تک پہونچنے کے لئے ان کی ایک نظر کافی ہے۔ اور ہم لوگ جو اپنے شاعر کی ہمہ گیری سے واقف ہیں یقین رکھتے ہیں کہ ربندر ناتھ کی سیاحت یورپ اور امریکہ ضرور کسی نہ کسی شکل میں بار ور ہو گی، کیونکہ ان کی نظر عمیق اہل یورپ اور اہل امریکہ کی فطرتوں کی تہوں تک ضرور ڈوب کے نکلی ہو گی اور ان کی آئندہ تصانیف غالباً ضرور اس رنگ میں ڈوبی ہوئی اور مغربی زندگی کے رموز سے مملو اور معمور ہونگی۔ یہ مشکل ہے کہ ان کی غائر نگاہ نے کہیں خطا کی ہو یا ان کی

لطیف اور باریک بیں ذہانت نے کسی چیز کو نظر انداز ہونے دیا ہو ظاہراً وہ کیسے ہی لاپرواہ اور بیگانہ معلوم ہوتے ہوں یہ ممکن نہیں کہ ان کا تخیّل ایک لمحہ کے لئے بھی غافل ہو جائے۔ ان کے تمام حواس جسمانی و دماغی ہر وقت بیدار رہتے ہیں اگرچہ بادی النظر میں وہ ساکن اور بے حرکت نظر آتے ہیں جن لوگوں سے وہ ملے یا جن لوگوں کو انھوں نے ایک سرسری نگاہ سے دوران سفر میں دیکھ لیا ان کی سب باتیں اور ان کے مقاصد ان کے دل پر نقش ہوتے گئے اور ان کے حواس ثانیہ کے مستقل اجزا بن گئے۔ ہر ایک شے کے عکس اس معرکۃ الآرا دماغ کے سنیسٹیو پلیٹ Sensitive Plate پر فوراً اُتر جاتی تھی اور اسی دماغ کے کسی ڈارک چیمبر Dark chamber میں اُن کا عکس معکوس نیگیٹو، ڈیولپ ہو رہا ہوگا۔ بالکل متضاد فطرتوں کے رموز شناسی اور بالکل برعکس جذبات کی مصوّری ربندر ناتھ کا خاص حصّہ ہے اور ربندر ناتھ کی خصوصیت ہم کو مدّ نظر رکھنی چاہئے۔ جو لوگ کلام ٹیگور کا محض سرسری مطالعہ کرکے

ان کے گرویدہ ہو گئے ہیں وہ ان خاص کیفیتوں میں سے محض چند کیفیتوں سے متاثر ہوئے ہیں جن کو شاعر نے نہایت خوبی کے ساتھ ادا کر دیا ہے۔ ٹیگور کے یہ شایقین اپنے تخیل کو محض ان چند کیفیات تک محدود کر دیتے ہیں اور اسی کو ٹیگور کی پیروی سمجھتے ہیں مگر جب رمز ٹیگور سے کوئی بخوبی واقف ہو جاتا ہے تو اس کو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ شاید ٹیگور کی کوئی اپنی شخصیت ہے ہی نہیں بلکہ جس عقدہ کا نام ٹیگور ہے وہ جذبات انسانی کا ایک مجسم مجموعہ ہے جس میں کسی ٹیگور کا نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے دل دھڑک رہے ہیں اور جس میں جذبات انسانی اظہار کے لئے بیتاب و پریشان ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس معمہ کو ٹیگور کہتے ہیں وہ کوئی وادی ہے جس میں بے شمار اور لاانتہا انسانی جذبات و کیفیات کی نہریں جاری ہیں۔ کیا عجب ہے اگر اہل مغرب ٹیگور کی ہم رخی اور جامعیت سے گھبرا جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ شعرا فلسفیوں کی طرح منطق میں اپنے کو محدود

نہیں کر سکتے ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ اپنے کمال اور تخیّل کو منطق پر قربان کر دیں۔ قیود منطق سے کلام ٹیگور بالکل آزاد ہے۔ ٹیگور آزادی کی جیتی جاگتی تصویر ہیں اور ان کے کمال کی ماہیّت جاننے کے لئے اُن کی آزادی مدّنظر رکھنی چاہیئے۔ صداقت اور اصلیت جوش حیات سے تڑپ رہی ہے اور محض منطقی اصولوں کی صورت میں یا کسی خاص مذہبی اعتقاد کی شکل میں پیش نہیں کی گئی ہے۔

کلام ٹیگور کو سمجھ کر پڑھنے سے یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ صداقت کی کسوٹی شاید منطق نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صداقت اور اصلیت منطق سے کہیں زیادہ وسیع ہیں کلام ٹیگور کا رجحان حقیقت کی طرف ہے۔ سگ منطق بھونکتا رہتا ہے۔ لیکن ٹیگور کا مضمون اس طرح چلا جاتا ہے۔ ؎

کہ جیسے جائے کوئی مست فیل بے زنجیر

اور یہ عارفانہ تجاہل ہے جو منطق کا غرور محض اپنی بے رُخی سے توڑ کر چور چور کر دیتا ہے۔ رابندر ناتھ کی منطق اپنی ثبوت آپ

ہے۔ ان کی دلیلیں وہ جذبات انسانی ہیں جن کا احساس دلایل عقلی سے کہیں گہرا ہوتا ہے۔ ٹیگور کا کمال یہ ہے کہ وہ جذبات کو گویائی عطا کر کے خاموش ہو جاتے ہیں اور کلام ٹیگور محض اس خاموش اسٹیج کی طرح ہے جس پر جذبات خود ایکٹ کرتے ہیں اور کیفیات انسانی بے ساختہ پردوں سے نکل آتے ہیں۔

ٹیگور صرف سین اور ڈراپ سین کی ترتیب دیتے رہتے ہیں۔ اور پردہ اُٹھانے اور گرانے میں محض یہ ملحوظ رکھتے ہیں کہ ہر ایک جذبہ اپنا قصہ صاف مؤثر اور پُر جوش الفاظ میں بیان کر کے دوسرے جذبات کی سرگذشت بھی سُن لے۔

اکثر شعرا کے برخلاف ربندر ناتھ نے قلم ہاتھ میں لینے کے قبل کسی خاص فلاسفی یا مذہبی اعتقاد کو کوئی راضی نامہ نہیں لکھا۔ اجلاس منطق یا اجلاس فلسفہ یا اجلاس مذہب کے روبرو کوئی حلف نہیں اُٹھایا اکثر شعرا بلا کوئی اصول قائم رہے کچھ لکھ ہی نہیں سکتے۔ شیکسپیر تک حالانکہ وہ ڈرامہ نویس تھا اپنی

شخصیت کی زنجیر نہیں توڑ سکتا تھا۔ اور اپنی بینی اپنے ہیروز اور اپنی ہیروئنس کی زبانوں سے کہلاتا تھا مگر ٹیگور کا کلام ڈرامیٹک آرٹ کا اعلیٰ نمونہ اور شاعرانہ بیگانگی کی بہترین مثال ہے۔

یہ انتہا درجہ کی بیگانگی اور انتہا درجہ کی ہمدردی ٹیگور کی کامیابی کا راز ہے جس نے ان کے کمال کو چار چاند لگا دئے ہیں ایک معمولی مثال اس کی یہ ہے کہ مسئلہ تناسخ یا آواگوں کو یا بت پرستی کو جن میں عام ہندوں کو پورا اعتقاد ہے۔ مگر جو ٹیگور کے ہم مذہب برھمو سماجی نہیں مانتے۔ ربندر ناتھ نے اپنی کئی نظموں میں نہایت ہمدردی سے پیش کیا ہے۔ اور ہندؤں کے ان جذبات کو نہایت پر تاثیر الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔ واقعی ربندر ناتھ جذبات کے شاعر ہیں۔ اور ان کا کلام حیات روزمرّہ کے جذبات اور اعلیٰ درجہ کے روحانی اثرات سے مالا مال ہے۔ ربندر ناتھ کو جہاں کہیں صداقت نظر آجاتی ہے وہیں اُن کا سر جھک جاتا ہے۔

اسی لئے کبھی وہ ودیت داد یا دوئی کے راگ الاپتے ہیں، کبھی وحدت وجود کا نغمہ چھیڑ دیتے ہیں اور کبھی ہمہ اوست کا

نعرہ بلند کرتے ہیں ۔ وحدت وجود یا ہمہ اوست یہ دو ایسی بلندیاں ہیں کہ اولاً تو اہل مغرب اس پر چڑھتے ہوئے گھبراتے ہیں اور کسی طرح دم بھر کو ان چٹانوں کی چوٹیوں پر پہونچ بھی گئے تو نیچے دیکھتے ہوئے ان کے ہوش اُڑ جاتے ہیں اور اُن کا دل تھرتھرانے لگتا ہے ۔ مگر ربندر ناتھ کے رگوں میں ہندو رشیوں کا خون موجزن ہے اور وحدت کی بلندی پر ان کے سر میں چکر نہیں آتا ۔ کلام ٹیگور کا فلسفہ جاننے کے لئے رویندر ناتھ کی ہندو نسلیت مدنظر رکھنی چاہئے ۔ ان کی ہندو نسلیت کا اثر ان کے کلام پر ہونا ضروری ہے ۔

ہندؤں کا خاص مذہبی عقیدہ جو کچھ ہو مگر وحدت وجود ہمہ اوست ایسے اصول ہیں جو صدیوں سے ہندؤوں کے دلوں پر اپنا اثر ڈالتے رہے ہیں اور جو ان کی زندگی اور ان کے جذبات میں سرایت کر گئے ہیں ۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ رویندر ناتھ کی حقانی نظموں میں وحدت اور ہمہ اوست کی آواز سنائی نہ دے جاتی ۔

کلام ٹیگور سے کچھ حصہ اقتباس کر کے یہ بات اچھی طرح سے ثابت کی جا سکتی ہے۔ ان کے انتخابوں میں بالکل متضاد اور برعکس عقیدے وجذبات اور مختلف کیفیتیں قلم بند کی گئی ہیں جو اصول منطق اور فلسفہ کے خلاف ہیں مگر جو بلحاظ شاعری اپنی اپنی جگہ پر درست وزیبا ہیں۔ شاعر کا کام ہے چیزوں کی ہستی میں اپنی ہستی مٹا دے نہ کہ نیک و بد صحیح و غلط کا فیصلہ کرنے بیٹھے۔ کسی جذبہ کا نمود اس کی صداقت کا خود ثبوت ہے۔ ٹیگور ہم کو ہر طرح کے جذبات سے لذّت آشنا کرا کے اس سچّی برادرانہ ہمدردی کا سبق سکھلاتے ہیں جو ہندو تہذیب کے مایۂ ناز ہے اور جس سے وہ مذاہب محروم ہیں جنھوں نے بہشت و نجات کا ٹھیکہ کسی خاص عقیدے یا کسی خاص انسان کو دیدیا ہے۔ یہ فخر صرف ہندو مذہب ہی کو حاصل ہے کہ اس کے آغوش میں بُت پرستی سے لے کر اہم برھم (انا الحق) ایک صلح کل کے عالم میں پل رہے ہیں اور جو متضاد فلاسفے کھیل رہے ہیں۔ کلام ٹیگور اُسی ہندو تہذیب و تربیت کا عکس ہے جس کا کام ہی کثرت میں

وحدت کا تماشہ دکھلاتا ہے۔ ہندو نقطۂ خیال سے مختلف فلسفے واقعی مختلف نہیں ہیں بلکہ صداقت اور حقیقت کی مختلف تفسیر ہیں۔ متضاد جذبات و مختلف عقائد ایک ہندو کے دل کو نہ صدمہ پہونچا سکتے ہیں نہ اس کو حیرت انگیز معلوم ہو سکتے ہیں یہی فلسفہ ہے کلام ٹیگور کا اور یہی راز ہے ان کی حیرت انگیز ہمہ گیری اور وسعت کا۔

مئی ۱۹۱۳ء کے نارتھ امریکن ریویو میں ایک لائق خاتون نے سنکلیر گیتانجلی پر تنقید لکھتے ہوئے فرماتی ہیں "صرف چند مقاموں سے تت توم اسی (تم وہی ہو) کے تصوّفانہ مقولہ کی صدا سنائی دے جاتی ہے محض کہیں کہیں وہ سُریلے اور پُر اثر نغمے بلند ہو جاتے ہیں جو وحدت وجود اور ہمہ اوست کا اعلان کرتے ہوئے ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ تمام ہستیوں کا منزل مقصود وہی ایک ہستی ہے جن میں دنیا کی ہستیاں پنہاں ہو جائیں گی"۔ ربندر ناتھ نے بنگلہ گیتانجلی سے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے قصداً وحدانیت کی نظموں کو انتخاب کر لیا ہے۔ ورنہ وحدانیت کی

آواز بہت دور تک بنگلہ گیتانجلی میں گونج رہی ہے۔ آگے سنکلیر نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ٹیگور کی عظمت کا اندازہ محض اس قسم کی نظموں سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہیں کہ ان کا کوئی خاص رنگ ہی نہیں اور نہ وہ کسی خاص عقیدہ کے پابند ہیں۔ وہ روح کی ہستی کا خدا کی ہستی میں فنا ہو جانا یا اس کا خدا سے الگ ہو کر باحیثیت عابد کے خدا کی پرستش کرنا دونوں رنگوں میں قادر ہے اور دونوں کیفیتوں کا لطف یکساں اُٹھاتے ہیں۔ چنانچہ گیتانجلی میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"اے مرے مہر درخشاں ہیں موسمی خزاں کے اس لکۂ ابر کی طرح ہوں جو بیکار اِدھر اُدھر اُڑتا پھرتا ہے کرنوں نے مجھے چوم کر ابھی گلا نہیں دیا کہ میں فنا ہو کر تیرے نور میں مل جاؤں۔

اگر تیری مرضی ہے اور اگر تجھے یہی انداز پسند ہے تو میری اس پریشان ہستیِ موہوم کو لے کر اس میں اپنی کرنوں کی

رنگ آمیز ہی کر دے اُسے سُنہرے رنگ سے چمکا دے اور آسمان پر مختلف اور پُر لُطف منظروں میں پھیلا دے۔

اور جب تیری خوشی یہ ہو گی کہ رات کو یہ کرشمہ ختم ہو جائے تو میں شب کی تاریکی میں فنا ہو جاؤں گا اور اگر تو چاہے گا تو صبح کی منور تر و تازگی میں پھر نمایاں ہو جاؤں گا۔"

یہاں روح کا ذات ایزدی میں فنا ہو کر ہمیشہ کے لئے اپنی ہستی کھو بیٹھنے کا منشا نہیں ہے بلکہ خدا میں پنہاں ہو کر پھر اپنی ہستی کو پا جانا مراد ہے۔ مگر مغربی منطق کی سمجھ میں یہ دونوں باتیں مشکل سے آئیں گی کیونکہ اہل مغرب مسئلہ ہمہ موجودگی immanenence کو اس کے حدود و نتائج تک لے جانے میں ہچکچاتے اور پہلو تہی کرتے ہیں ورنہ وحدت و کثرت کا ظاہرا اختلاف ان کو اتنا پریشان نہ کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر اہل تصوّف خدا سے ذاتی تعلق کو (جس میں اپنی ہستی خدا کی ہستی میں مفقود نہ ہو جائے بلکہ قائم رہتی ہوئی ورِ مطلق کا نظارہ کرتی رہے) تصوّف اور عشق کی جان سمجھتے ہیں۔ مگر کیا یہ کیفیت

ہمیشہ طاری رہ سکتی ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی کیفیت نہیں ہے۔ عاشق و معشوق کے تفرقہ کا احساس اور جذبۂ عشق کا احساس بھی اکثر مٹ جاتا ہے۔ اور بقول غالب صوفی کی کبھی وہ حالت بھی ہو جاتی ہے کہ

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

محض فلسفہ سے اپنی اور خدا کی ہستی کی یگانگت کو سمجھ لینا اور محض دلایل سے اس خیال کو تقویت دے لینا اور بات ہے اصل چیز وہ روحانی احساس اور جذبہ ہے جو ہندو تہذیب کی آب و ہوا میں نشو و نما پاتا ہے۔ جب ہم اس سے جُدائی کا پُر درد نغمہ گاتے ہیں تو ایک ایک الاپ ہم کو اس سے قریب تر کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ یکتائی کا احساس ہوتے ہوتے "من تو شدم تو من شدی" کا نعرہ بلند ہو جاتا ہے۔ کلام ٹیگور کو اس روشنی میں اگر دیکھا جائے تو اس میں کسی قسم کا تضاد باہمی نظر نہ آئے گا۔ ہمارے شاعر کے کمال کے عالمگیر ہونے کا اس سے

بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اسے طالب و مطلوب کی یگانگت کے مسئلہ کو اس قدر دلفریب و شیریں بنا دیا ہے کہ اہل مغرب کا دل بھی وجد کرنے لگتا ہے۔

گیتانجلی کے مندرجہ ذیل گیت میں اس وصل اور جدائی کے مضامین کو اس خوش اسلوبی سے ایک ہی لڑی میں آویزاں کر دیا ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ کہتے ہیں

"اے میرے خدا میری زندگی کے لبالب ساغر سے تو کونسی مے رنگین نوش کرے گا۔ اے میرے شاعر کیا تیرا دل اپنی خلقت کو میری آنکھوں سے دیکھنے کو چاہتا ہے۔ اور کیا میرے کانوں میں جہاں آواز گونج کر الفاظ کی صورت پکڑ جاتی ہے اور تیرا نغمۂ حقیقت اپنے سُر اُن میں بھر جاتا ہے۔ اور اُن الفاظ میں تیری ٹنکار سنائی دیتی ہے کیا تو اسی کو سُن رہا ہے۔ اے میرے خدا کیا تو اپنی ہستی میرے حوالے کر کے اپنے کو میرے آغوش میں دیکھ کر خوشی میں پھولا نہیں سما رہا ہے اور فرط مسرت سے جھوم رہا ہے۔ میرے خدا یہ کیا دلفریب کرشمہ ہے۔"

گیتانجلی کی یہ نظم اوپنشدوں کے چند حصّوں پر روشنی ڈال رہی ہے اور صدہا صدیوں کی آواز اس گیت میں سنائی دے رہی ہے۔ اوپنشدوں میں ایک جگہ آیا ہے کہ "جب اُسے (خدا نے) چاہا کہ میں کئی ہو جاؤں تو اس کے اس خیال سے عالمِ صور وکثرت نمودار ہو گیا اور اس کثرت میں پھر اس کی وحدت سرایت کر گئی اور آئینہ خانہ جہان میں اپنی صورت دیکھ کر اسے خود حیرت ہو گئی۔ ہم تماشا گاہ جہاں میں اُس کا جلوہ دیکھنے کے لئے اچھی اچھی دوربینیں ایجاد کرتے ہیں اور اُس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ہمارے دلوں میں اپنا جلوہ دیکھنے کے لئے اور اپنا نغمۂ خاموش سُننے کے لئے بیتاب ہے۔ کیسا زبردست اور بلند پرواز تخیّل ہے۔ مگر ربندر ناتھ کی شاعری ان بلندیوں پر بے دھڑک چڑھ جاتی ہے۔ چونکہ خدا خود ہماری ہستیوں میں موجود ہو کر دنیا کے مزے اُٹھانے کے لئے بیتاب ہے۔ اسی وجہ سے ہم سب دنیا کے مزے اُٹھانے کے لئے بیتاب ہیں۔ لہٰذا کلام ٹیگور میں کثرِ نفسی و ترکِ دنیا و عزلت پسندی کی ترغیب نہیں دی گئی۔

بلکہ جب کوئی یہ کہتا ہے "ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا" تو ٹیگور کہتے ہیں ہوس کو ہوس سمجھنا غلط فہمی اور بزدلی ہے کیونکہ ہوس اُس روحانی بیچینی کا نام ہے جب ذات مطلق تنہائی سے گھبرا کر کثرت کا تماشا دیکھنا چاہتی ہے ۔ فقرا ترک دنیا کا وعظ تو ضرور کرتے ہیں مگر تخلیق جہاں میں مشیت ایزدی کیا تھی اُس کا وہ کیا جواب دیں گے آخر دنیا کی لذتوں کو شیطان نے تو پیدا نہیں کیا دنیا کے مزے اُٹھانا عین عبادت ہے ۔ بشرطیکہ کوئی راز خلقت کو سمجھ جائے۔

داخل ہے خدا وقت بھی شکر و سپاس میں
خوش ہو رہے ہیں ابر کو میخوار دیکھ کر

یا بقول سعدی

صوفی از صومعہ گر خیمہ بزن در گلزار
وقت آن نیست کہ در خانہ نشینی بیکار

ارتکا کا راز اس تخیل میں پنہاں ہے ۔ ترقی کی جان بھی شورش ہے ۔ جب شاعر کا دل پوچھتا ہے کہ میری زندگی کے

لبالب پیالے سے کونسی شراب ارغوانی تو پئے گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا کیا کمال میں اپنی ذات میں بہم پہونچاؤں کہ تیری معبودیت کی داد دے سکوں کس پاکیزگی سے اپنی ذات کو بھر دوں کہ تیری پرستش کے قابل ہو جاؤں۔ جلوہ قدرت کا عالم میں آشکارا ہو کر نشو و نما پانا فلسفہ ارتقاد فلسفہ عبادت کا اصلی مقصود ہے۔ بھگوت گیتا کی دسویں منزل میں اور پلیٹو کے ڈاکٹرن آف ایڈیاز Doctorine of idas میں بھی یہی باتیں بتلائی گئی ہیں۔ اس بات کے احساس نے ٹیگور کے تخیل کو منوّر اور پُر زور بنا دیا ہے۔ اور اُن کی ایک ایک نظم سورج کی شعاعوں کی دنیا کی چیزوں کو جگمگا دیتی ہے اور زندہ بنا دیتی ہے۔ کیونکہ ٹیگور اس شورش کو اس روحانی بیچینی کو جو ترقی کی جان ہے سمجھ گئے ہیں۔

بقول اُستاد میرؔ

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

ممکن ہے کلامِ ٹیگور کے فلسفہ پر یہ رائیں قطعی طور پر درست نہ ہوں ممکن ہے اور بھی کئی اجزا ربندرناتھ کے تخیل میں داخل ہوتے رہے ہوں کوئی چاہے تو اور طرح کے فلسفے بھی کلام ٹیگور سے اخذ کر سکتا ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے ۔ کیونکہ ایسے ہمہ گیر شاعر کو کسی مخصوص اعتقاد یا فلسفہ کا پابند کر دینا مناسب نہیں ہے ۔

ٹیگور بھی ایسی تفسیروں کے روبرو چپ چاپ رہتے ہیں وہ اپنے معبود کو بلا کسی فلسفہ میں اس کی ذات کو مقیّد کئے ہوئے بخوبی جانتے ہیں ۔ ان کا گہرا روحانی احساس کسی فلسفہ کا محتاج نہیں ۔ گیتانجلی میں ایک جگہ کہتے ہیں ۔

"لوگوں میں میں نے یہ فخر کیا کہ میں تمھیں جانتا ہوں ۔ لوگ میرے کلام ہیں ہر جگہ تمھاری ہی تصویر دیکھتے ہیں اور مجھ سے آکر دریافت کرتے ہیں کہ وہ کیا ہے ۔ اور کون ہے میں نہیں جانتا انھیں کیا جواب دوں اور یہ کہہ دیتا ہوں کہ واقعی میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ وہ مجھ سے آزردہ اور خفا ہو کر چلے جاتے

ہیں اور تم وہیں بیٹھے مسکراتے ہو۔"

"میں نے تمہارے افسانے دلفریب الفاظ میں نظم کئے۔ تمہارا راز پنہاں بے اختیار ہو کر میرے دل سے نکل پڑتا ہے لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں نہیں جانتا انھیں کیا جواب دوں اور یہ کہہ دیتا ہوں کون جانے ان اشعار کا کیا مطلب ہے وہ طنز سے ہنس کر میری مذمت کر کے چلے جا رہے ہیں اور تم وہیں بیٹھے مسکراتے ہو۔

بنگال کے ادبی دائروں میں اکثر اُن کی چند نظموں اور دیگر کلام کے نفس مطلب پر نقادوں اور علما میں بحث ہوتی رہی ہے مگر ٹیگور ہمیشہ خاموش رہے ہیں اور اپنی رائے ظاہر کرنے سے ہمیشہ بچتے رہے ہیں۔ مس سنکلیر صاحبہ نے اپنے مضمون مذکور میں ایک بات اور کہی ہے جو قابل توجہ ہے وہ کہتی ہیں۔

"اُپنشد اُس روحانی خلش اور تشنگی کو جو محض ذات مطلق کے وصال کے احساس سے مٹ سکتی ہے (ہیجل کی فلاسفی سے بھی بڑھکر) دور کرتے ہیں اپنسدی اس کیفیت کو پیدا کر سکتے

ہیں جس میں اپنی ہستی اور خدا کی ہستی میں واقعی وصول ہو جاتا
ہے اہل تصوّف اس کیفیت کے ہمیشہ سے جویاں رہے ہیں
اور جب وہ ٹیگور کو ویدانتی یا بُدھسٹ یا کسی مخصوص فلسفہ میں
باندھ نہیں سکتے تو اُن کو ایک طرح کی مایوسی ہوتی ہے جب
ٹیگور یہ کہتے ہیں کہ " ہر زمانہ تجھ سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا گذر
جاتا ہے" تو یہ لوگ بُرا مانتے ہیں یعنی اہل ہند کو اور وحدت
وجود کے ماننے والوں کو کوئی حق نہین کہ وہ کوئی ایسی بات
کہیں جس میں خدا اور انسان میں ذاتی تعلق اس طرح سے
بتلایا گیا ہو جس سے دونوں کی ذات میں تفرقہ کا اندیشہ ہو"
یہ خیال کہ اہل ہند یا وحدت وجود کے ماننے والوں کو کوئی
حق خُدا اور انسانی میں ذاتی تعلق قائم کرنے کا نہیں ہے۔
اُن چلاک اور خود غرض عیسائیوں کی گڑھنت ہے جو ویدانت
کی عظمت اور فلاسفی کو ضرر پہونچانے کے لئے عوام کو دھوکا
دینا چاہتے ہیں ۔ سوال تو یہ ہے کہ آخر اس ذاتی تعلق کا مفہوم
کیا ہے کیا ہندوؤں سے بڑھ کر کوئی بھگتی یا ذاتی تعلق کا دلدادہ

رہا ہے۔ ہر ایک ہندو میں وہ روحانی احساس ہے جس میں اپنی ہستی اور ہستی مطلق سے خاص تعلق قائم رہتا ہے۔ واضح رہے کہ اہل ہنود میں ایکتائی کی ہوس محض فلسفیوں کی علمی اور دماغی حرص نہیں ہے جو محض اپنے خیال کو فلسفۂ وحدت سے بذریعہ چند عقلی دلیلوں سے تقویت دے لیتے ہیں۔

ہندوؤں میں وحدت وجود محض اعتقاد یا عقلی ریاضت کی صورت میں نہیں رہا ہے۔ بلکہ ایک روحانی تجربہ اور کیفیت کی شکل میں قائم رہا ہے۔ ہندوستان میں مذہب فلسفہ کی جان اور فلسفہ مذہب کی عقلی دلیل رہا ہے۔ خشک عقلی مشائل سے ہندوؤں کو ہمیشہ وحشت رہی ہے۔ مذہب ہندوؤں کے لئے چند اعتقاد کا انبار نہیں بلکہ روحانی کیفیت کا مفہوم رہا ہے۔

یہ بات کبھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ رابندر ناتھ کا کلام موجودہ فلسفوں میں سے کسی میں بھی محدود نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ٹیگور کی شاعری کا سرچشمہ عقلی دلائل اور منطق نہیں ہے بلکہ وہ روحانی تجربہ ہیں جو کسی خاص اعتقاد یا فلسفہ سے منسوب

نہیں کئے جا سکتے۔ مروّجہ قواعد کے مطابق کلام ٹیگور اختلاف باہمی
اور برعکس جذبات سے پُر ہو مگر اہل مذاق جانتے ہیں کہ درحقیقت
کلام ٹیگور کے مختلف حصّوں میں کوئی تناسب اور سلسلہ ضرور ہے۔
جس کو کسی خاص نام سے منسوب نہیں کر سکتے۔ مثلاً جو لوگ
اس بات پر ضد کرتے ہیں کہ ربندر ناتھ خدا کی ہستی کے قائل
ہیں انھیں ٹیگور مندرجہ ذیل الفاظ پر حیرت ہو گی۔

"جب میں اور یہ دنیا ایک تھے جب میرے جسم
پر سبزہ اُگا ہوا تھا اور بادِ بہاری جھوم کر مجھ پر سے
گذرتی تھی اور جب طلوع آفتاب کے وقت ان
سبزوں سے جو مانند پسینے کے میرے جسم پر اُگ رہے
تھے ایک ٹھنڈی نکہت نکلکر سورج کی کرنوں کی طرح
پھیل جایا کرتی تھی جب میری ہستی چرخ چنبریں کے
وسیع اور چکدار شامیانے کے نیچے پہاڑوں اور
دریاؤں اور میدانوں پر ایک لا انتہا وسعت کی
طرح پھیلی ہوئی تھی اُس وقت ایک خاص مسرّت

اور لُطف کا ہلکا ہلکا احساس میرے بے پایان جسم
میں گویا ایک غنودگی کی حالت میں ہوتا تھا اور ایک
خواب گذشتہ کی طرح اس کی یاد مجھے اب تک آتی ہے۔"

ان الفاظ سے دہریت ٹپک رہی ہے مگر ٹیگور کی شاعری وہ جادو ہے جو دہریت کے فلسفہ کو بھی خوشگوار اور پُر تاثیر بنا دیتا ہے۔ یہ الفاظ محض شاعرانہ جدّت اور مبالغہ نہیں ہیں بلکہ صدق دل سے محسوس کردہ جذبات معلوم ہوتے ہیں۔ یہ جذبات بھی اسی روحانی بیچینی کا نتیجہ ہیں جن سے مایۂ حیات کائنات (خدا) تنہائی سے گھبرا کر آغوش گیتی میں آکر اپنے اوپر مختلف کیفیات طاری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎ "میری ہستی نہیں وحدت میں کثرت کا تماشا ہے" اسی کثرت میں جذبات دہریہ کے مزے بھی ہیں۔ کہیں کہیں تو شاعر کو خود پتا نہیں ہے کہ چند جذبات اس کے اندر کس طرح پیدا ہو گئے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:-

"میں ایک زندہ پیانو (باجا) کی مانند ہوں۔ میرے
اندر تاریک پردوں میں بے شمار تار اور پُرزے اور

کمانیاں ہیں۔ معلوم نہیں کون آکر مجھے بجانے لگتا ہے۔
میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ مختلف نغمے میرے اندر سے
کیسے نکلتے ہیں میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس وقت
کونسی چیز بج رہی ہے اور آیا اُس کی آواز پُر درد
ہے یا مسرّت آمیز ہے یا سُر اونچے ہیں یا نیچے یا نغمہ
بے سُر وتال ہے یا ٹھیک ہے "

ربندر ناتھ درحقیقت ایک ہندو ہیں اُن کی شاعری ایک پھول ہے جس کی نکہت ورنگ صدیوں کی ہندو تہذیب سے نشو ونما حاصل کر رہی ہے۔ چاہے انھیں اس کی خود بھی خبر ہو یا نہ ہو۔ ان کو اپنے وطن ہندوستان سے گاڑھی محبّت ہے۔ وہ ہندوستان کی پُرانی عظمت اور تواریخی کارنامے اور پُرفضا مناظر پر دل وجان سے فدا ہیں۔ ہندوستان کی بود وباش اور زندگی کو وہ کہیں اور کی بود وباش اور زندگی سے تبدیل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بول پور ویپن شانتی نکیتن نام کے مدرسے میں قدیم ہندو طریقہ پر طلباء کی تربیت

کر رہے ہیں اور رو ہیں خود بھی تنہائی میں روحانی تصوّر میں غرق رہتے ہیں ان کے والد مہرشی دیندر ناتھ ٹیگور بھی یہیں تنہائی میں نیچرل منظروں کے آغوش میں سرگرم ریاضت رہا کرتے تھے ۔ رابندر ناتھ کا معمول ہے کہ ایک چھوٹی سی کشتی میں شام کو بیٹھے ہوئے یا لیٹے ہوئے دریائے گورائی کے مزے لیا کرتے ہیں آپ اس دل بہلاؤ کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

"میں ہر روز اپنے دل میں یہ پوچھتا رہتا ہوں کہ کیا میں اس سرزمین پر اس تاروں سے منوّر آسمان کے نیچے پیدا ہوں گا، کیا میں بنگال کے اسی گوشہ میں پھر پیدا ہو کر دریائے گورائی کے مزے اپنی ننھّی سی کشتی میں بیٹھ کر ہر شام کو لے سکونگا ندی کی دھیمی دھیمی چال اور آہستہ خرام ہوا میرے بیتاب دل کو تسکین دیا کرینگی ۔ ممکن ہے آئندہ جنم میں مجھے یہ چیزیں نصیب نہ ہوں ۔ کون جانے یہ منظر اس وقت کہاں چلے جائیں گے یا میں کس طرح کا دل و دماغ لے کر دنیا میں آؤں گا ۔ ممکن ہے کہ مجھے

ایسی شامیں کئی نصیب ہوں مگر کون جانے کہ اس وقت میں
شام کی سیاہ زلفوں کو اپنے اوپر لہراتے ہوئے دیکھ کر خوش
ہونگا یا وحشت زدہ ہو کر گھبرا جاؤں گا۔ کیا میں پھر پیدا ہو کر
وہی آدمی رہوں گا جو میں اب ہوں۔ جو کچھ ہو مجھے سب سے بڑا
ڈر اس بات کا ہے کہ کہیں یورپ میں پیدا نہ ہو جاؤں۔"

ان الفاظ میں ربندر ناتھ نے اپنا وطن ہماری آنکھوں کے
آگے کھول کر رکھ دیا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی محبت
میں ان کا دل دھڑک رہا ہے۔

رگھوپت سہائے فراق

ایک سوال کے کئی جواب

اُردو، ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ ہندوستان کے جس حصّہ کی بولی اُردو ہے اس حصّہ کی اُردو آباد مسلمان آبادی سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن اس کا کیا کارن ہے کہ اب تک نثر و نظم میں جتنے مسلمان اُردو ادیب گذرے ان کے مقابلے میں نام کرنے والے اُردو کے ہندو ادیب بہت کم گذرے۔ کم بھی گذرے اور اُردو شاعری میں تو نسبتاً کم مرتبہ کے بھی گذرے۔ میرؔ۔ سوداؔ۔ دردؔ۔ مصحفیؔ۔ انشاءؔ۔ نظیرؔ اکبرآبادی۔ ناسخؔ و آتشؔ۔ غالبؔ۔ ذوقؔ۔ مومنؔ۔ میرحسنؔ۔ انیسؔ و دبیرؔ۔ امیرؔ و داغؔ۔ حالیؔ۔ اکبرؔ۔ اقبالؔ۔ اتنے بڑے اور اتنی تعداد میں ہندو سماج نے اُردو شاعر نہیں پیدا کئے۔ صفِ دوم کے اُردو شعراء میں بھی مسلمانوں کی تعداد بہت بڑی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟

گھبراہٹ میں یا آسان فکری سے اس سوال کا جواب اکثر

لوگ یہ دے بیٹھتے ہیں کہ چونکہ اُردو میں فارسی۔عربی کی کافی آمیزش ہے اور چونکہ عرب و ایران کے کلچر اور روائتوں کو اُردو شاعری میں کافی دخل ہے اُردو کی فضاء مسلمان ممالک کی زندگی و ادب کی فضاء ہے اور ان تمام چیزوں سے یہاں کے مسلمانوں کو فطری مناسبت ہے اس لئے اُردو کی فضاء میں ہندو کم پنپے۔ یہ جواب بظاہر بالکل درست معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ جواب ہے بالکل غلط اور اس غلطی کے شکار قریب قریب وہ تمام ہندو اور مسلمان رہے ہیں جنھوں نے اس سوال کا جواب سوچنا چاہا۔

دوسرا جواب کچھ حلقوں سے یہ دیا جاتا ہے کہ اُردو ادب میں ہندوؤں کے نہ اُبھر سکنے کی یہ وجہ نہ تھی کہ ہندو شعراء مسلمان شاعروں سے کم قابل تھے بلکہ مسلمانوں کی تنگ نظری یا تعصب انھیں اُبھرنے نہیں دیتی تھیں۔ لیکن اقلیت اکثریت کو دبا کیسے سکتی تھی اور اتنا کیسے دبا سکتی کہ میر و غالب اور دیگر تمام اساتذہ اُردو کے برابر یا اُن سے بڑے ہندو شاعروں کو (اگر

ان کے برابر یا ان سے بڑے ہندو شاعر گذرے) اس طرح دبا دے
کہ میرؔ و غالبؔ کے ہم پلّہ ہندو شاعروں کا نام آج نہ کسی مسلمان کو معلوم ہے
نہ کسی ہندو کو۔ اگر اس پایہ کے ہندو شاعر ہوئے ہوتے تو اُن کے
نام کا چراغ تعصب کی پھونک یا تعصب کا جھونکا بجھا سکتا تھا؟

بہت سے لوگ اس سوال کا جواب دینے ہی سے کتراتے
ہیں۔ یہ لوگ ہندو مسلم اتحاد کے نام پر سلام و درود بھیج کر کہہ بیٹھتے
ہیں کہ اُردو کی ترقی و تعمیر میں ہندو مسلمانوں نے برابر برابر حصّہ
لیا ہے۔ اس کے بعد پنڈت دیا شنکر نسیمؔ۔ پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ
پنڈت برج نرائن چکبستؔ۔ منشی درگا سہائے سرورؔ جہان آبادی۔
اور دو چار اور ہندو ادیبوں کا نام سرپرستانہ مداحی کے ساتھ
لے کر خوش ہو لیتے ہیں اور لوگوں کو خوش کر دیتے ہیں۔ لیکن جو
سوال اس مضمون کے شروع میں اُٹھایا گیا ہے اس پر ایسے لاگ
طریقہ پر زور دینے اور اس کے جواب کے لئے اصرار کرنے کو
بدتمیزی سمجھتے ہیں یا غیر مہذب نامصلحت اندیش سخت گیری بتاتے
ہیں۔ لیکن سوال جہاں کا تہاں رہ جاتا ہے۔

لطف یہ ہے کہ شروع میں اُٹھائے ہوئے سوال کا صحیح جواب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیا جا سکتا ہے۔ یہ جواب ہندو کو مسلمان کو اور ان دونوں کے ہاتھوں اُردو کی ترقی چاہنے والوں کو ذرا بھی ناگوار نہ ہوگا۔

اب کان دھر کے سنئے یہ جواب۔ ہندی زبان کی کئی بولیاں تھیں مثلاً برج بھاشا۔ اودھی۔ بیسواری۔ بھوج پُری اور کھڑی بولی۔ اُردو کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ کھڑی بولی اُردو ادب کے جنم سے پہلے بلکہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے دلّی اور اطراف دلّی کے ہندوؤں کی بولی تھی۔ جب دلّی اور اطرف دلّی میں مسلمان آکر بس گئے تو جو کھڑی بولی اب تک صرف وہاں کے ہندوؤں کی بولی تھی وہ اب وہاں کے ہندو مسلمان دونوں کی بولی بن گئی مسلمانوں نے یہ بولی ہندوؤں سے پائی اور اس بولی نے مسلمانوں سے بہت سے ایسے عربی۔ فارسی لفظ پائے جنھیں اس بولی نے گویا گود لے لئے۔ بالکل بے تکلف اور بالکل فطری طور پر یہ عربی فارسی الفاظ اور ٹکڑے کھڑی بولی کے آنچل میں جگہ پا گئے۔ اگر

کہیں مسلمانوں کے دلّی اور اطراف دلّی میں آنے کے پہلے کھڑی بولی میں قابل قدر شاعری ہو چکی ہوتی اور ادبی نثر پیدا ہو چکی ہوتی تو عربی۔ فارسی الفاظ اور ٹکڑے کھڑی بولی میں ہرگز جگہ نہ پا سکتے کیونکہ ادبی سطح پر منظم ہو چکنے کے بعد کسی زبان میں دوسری زبان یا زبانوں کے الفاظ کھپائے اور پچائے نہیں جا سکتے۔ برج بھاشا اور اودھی کی شاعری میں دو ہی چار عربی و فارسی لفظ جگہ پا سکے کیونکہ ان بولیوں میں مسلمانوں کی شرکت کے پہلے اعلیٰ درجہ کی شاعری ہو چکی تھی۔ کسی بولی میں جب ادبیت آ چکتی ہے تو اس میں ایک گٹھیلا پن پیدا ہو جاتا ہے، اس میں نوک پلک پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے خدوخال اس کا نکھ سنکھ اس کی روپ ریکھا سب مخصوص اور واضح ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک شخصیت و انفرادیت بن جاتی ہے۔ مسلمانوں کے دلّی میں اور دلّی کے چاروں طرف بس جانے کے بہت دنوں بعد تک کھڑی بولی محض ایک بولی رہی ایک ایسی بولی جس میں چالیس ہزار سو فی صدی دیسی لفظ تھے اور ڈیڑھ دو ہزار عربی۔ فارسی لفظ آ سکے تھے۔ ادب تو

کھڑی بولی کا ادب بنتا تھا۔ یہ ادب دلّی میں بنا۔

اس دوران میں دلّی کی تمدنی زندگی کی پیشوائی اور رہنمائی مسلمان سماج کے ہاتھ میں آچکی تھی۔ دلّی دربار اس تمدّنی زندگی کا مرکز تھا۔ اس متمدّن ذہنیت کے زیر اثر رچی ہوئی کھڑی بولی کی روائتیں پیدا ہونا شروع ہوئیں۔ کھڑی بولی کے لب و لہجہ میں اس کے طرز ادا و طرز زبان میں شوخیاں اور نکھار پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ اس میں نئی نئی روک تھام اور نئی نئی لچک پیدا ہونے لگی۔ اس کی سادگی میں ایک ٹیڑھ اور اس کے بانک پن میں ایک سیدھ پیدا ہونے لگی۔ مسلمانوں کے گھریلو زندگی اور ان کی مجلسی زندگی کی سنوار کھڑی بولی کو حاصل ہونے لگی۔ دلّی اور اطراف دلّی کے ہندو اس تمدّن کی پیشوائی نہیں کر سکتے تھے جس کے زیر اثر کھڑی بولی کے غنچے چٹک رہے تھے ہندوؤں کے لئے بھی بہت تھا کہ ان کے کچھ افراد اب اپنی ہی گھریلو کھڑی بولی کی تہذیب یافتہ شکل کو سیق کی طرح سیکھنا شروع کریں کچھ رُک رُک کر کچھ اٹک اٹک کر اپنی مادری زبان کا

وراٹ روپ (شکل اعظم) یا مہاروپ دیکھنا اور جاننا اور اپنانا کارے دارد۔ برنرڈ شا نوے برس کی عمر میں کہہ اُٹھا کہ زندگی بھر وہ ایک ہی زبان سیکھنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ یعنی اپنی مادری زبان انگریزی۔

نہیں سہل اے داغؔ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اپنی زباں آتے آتے

اس بات کو کھلے دل سے مان لینے سے ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات بگڑ نہیں جائیں گے کہ شروع میں کھڑی بولی کو سان اور کھرا اوپر چڑھانے کی صلاحیت صرف دلّی میں بسے ہوئے مسلمانوں کو تھی۔ اکثریت اور اقلیت کے الفاظ بھی یہاں دھوکہ دے دیں گے اگر ہم یہ نہ جان لیں کہ کھڑی بولی کا جس طرح اب اُٹھان ہو رہا تھا۔ اس کا سویا ہوا جادو جس طرح اب جاگ چلا تھا۔ اس کے بچپن اور اس کی جوانی کی حدیں طرح اب مل رہی تھیں جب اس کے نکلتے بیٹھتے دن تھے اسے دیکھ کر جتنے مسلمان اس کی طرف کھنچے اس سے بہت کم ہندو اس کی طرف

کھنچے اور وہ بھی مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ۔ کیا مطلب اکثریت اور اقلیت سے ؟ ڈیڑھ سو برس کے اندر جتنے مشاعرے ہندوستان بھر میں ہوئے ہیں ان میں پڑھنے والوں اور سننے والوں کی تعداد کو دیکھ لیجئے دس فی صدی ہندو اور نوے فی صدی مسلمان نظر آئیں گے ۔ البتہ میں جیسا آگے چل کر بتاؤں گا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مستقبل کے اُردو مشاعروں میں ہندو اسّی فی صدی اور مسلمان بیس فی صدی نظر نہ آئیں گے ۔

لیکن یہ سمجھنا حماقت ہے کہ مسلمان اُردو شاعری اور اُردو مشاعروں میں اس لئے کثرت سے شرکت کرتے تھے کہ وہاں عرب اور ایران کا حال سنیں یا عربی فارسی کی گونج سے اپنے کان سینکیں ۔ یا وہاں جاکر اپنے مذہب ، اپنے خدا ، اپنے رسول پر سلام و درود بھیجیں ۔ مشاعروں میں دیوبند اور ندوہ کے علمأ کرام جمع نہیں ہوتے تھے ۔ مشاعرے صحن مسجد میں نہیں ہوتے تھے ۔ مشاعرے کسی بھی لحاظ سے اسلامی انجمنیں نہیں تھے ۔ جو مسلمان مشاعروں میں آتے تھے ان سے کم عربی ۔ فارسی الفاظ

ہندو نہیں جانتے تھے۔ چودہ پندرہ برس کا ہندو لڑکا وہ تمام عربی فارسی الفاظ جان لیتا تھا اور اچھی طرح انھیں اشعار میں کھپا سکتا تھا۔ جو اُردو شاعری اور مشاعروں کی کائنات تھے۔ مٹھی بھر عربی فارسی الفاظ کے بل بوتے پر مسلمان ہندوؤں کو اُردو شاعری کے میدان میں دبا نہیں سکتے تھے۔ اُردو شاعری میں جو علائم یا اشارے یا تمثیلیں موجود ہیں ان پر بھی ہندو اسی آسانی سے قدرت حاصل کر لیتا جس آسانی سے مسلمان۔ لیکن کھڑی بولی جب نکھرنے لگی تو اس کی جو جھلک دیکھ کر ہندوؤں ہی کی نہیں بلکہ ناسخ اور آتش جیسے اُستادوں کی آنکھیں جھپک جاتی تھیں۔ اس کی کچھ مثالیں یہ ہیں :۔

ایک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو　　صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

دوسرا مصرعہ اتنا بے لاگ ہے کہ جب ایک لڑکے سے یہ مطلع سُنایا تو ناسخ و آتش نے اپنی اپنی غزلیں پھاڑ ڈالیں ——— یا :۔

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اُستاد وزیر کے اس مصرعہ ع

"اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے"

اس کی اصلاح بالکل غیر ارادی طور پر ایک پتنگ اُڑانے والے لڑکے نے یوں کر دی تھی:-

"اسی دن کو تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے"

کھڑی بولی میں جو قیامت کا اثر اور جو صبح ازل کی بہار و تازگی آئی وہ عربی فارسی ترکیبوں یا اضافتوں کی مرہونِ منت نہیں تھی۔ مثلاً یہ مصرعہ اور اشعار:-

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے جو اُٹھائے نہ اُٹھے ۔ کام وہ آن پڑا ہے جو بنائے نہ بنے

زمانہ کے ہاتھوں سے چارا نہیں ہے زمانہ ہمارا تمھارا نہیں ہے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

سودا جو تیرا حال ہے ایسا تو نہیں وہ کیا جانئے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

یاد اتنی اُس کی خوب نہیں میر باز آ نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائے گا

بھر آئے پھول کے آنسو پیارم شبنم سے کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

اکبر کو نیند آ گئی صحرا کو دیکھ کر عباسؔ جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

"دُنیا یہی دُنیا ہے تو کیا یاد رہیگی"

"تیری دُنیا میں اب دھرا کیا ہے"

"اس عمر میں انساں کو سمجھائی نہیں دنیا"

"کیا دِوانے نے موت پائی ہے"

تارا ٹوٹتے سب نے دیکھا یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی

کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹ گیا

"جینا اُسے ہو گیا اجیرن"

"بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے"

"یہ پچھلی رات یہ رگ رگ میں نرم نرم کسک"

"گاڑی نکل گئی تھی پٹری چمک رہی تھی"

"جب تک امام آئیں انھیں دیکھ بھال لو"

کیا سے کیا کر دیا محبت نے اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

"زندگی کیسی مصیبت ہے اثرؔ سے مت پوچھ"

آج تو داغ کو ہم لوگ ترے کوچہ سے

اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

"کچھ اُڑھا دیجئے مولا مجھے نیند آتی ہے"

"بھرے ہیں آنکھوں میں آنسو اُداس بیٹھے ہو"

"کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

"دیکھئے آپ کو اور آپ کے گھر کی صورت"

"عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی"

"نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری"

"جس کو غصہ میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے"

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا

کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

زلف میں پھنس کے فرن اب ہے یہ وحشت کیسی

سانپ جب کاٹ لیا سیکھنے منتر بیٹھے

"جو ماننے کی بات نہ تھی مان گئے ہم"

"کبھی کچھ رات گئے اور کبھی کچھ رات رہے"

"تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی"

"ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے"

"تڑپنے والے تڑپ کر فلک کو چھو آئے"

"اے بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا"

جھکتی ہے نگاہ تیری مجھ سے مل کر دیوار سے دھوپ اُتر رہی ہے گویا"

"مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے"

"مَیں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے"

"یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں"

"یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو مَیں"

"تری آواز مکّے اور مدینے"

"عقل کو سرد کر دیا روح کو جگمگا دیا"

یہ ہے کھڑی بولی کا سجل اور سُگھڑ روپ۔ یہ ہے کھڑی بولی کی سجاوٹ اور اس کا رچاؤ۔ ان اشعار اور مصرعوں میں جیسی اور جتنی

فارسی، عربی ہے وہ جیسے مسلمان کو لکھنے آتی ہے ویسی ہی ہندو کو بھی لکھنے آتی تھی۔ لیکن بظاہر سب سے زیادہ اچنبھے کی بات جو ہے وہ یہ ہے کہ ہندی کے وہ الفاظ اور فقرے جو اُن اشعار اور مصرعوں کو سولہوں سنگار سے سجا کر انھیں سدا سُہاگ دے رہے ہیں وہی ہندی الفاظ اور فقرے اس لوچ اور سُگھڑ پنے کے ساتھ مسلمان استعمال کر سکتے تھے اور ہندو اس انداز سے استعمال نہیں کر سکتے تھے بلکہ خشک اور ٹھوس طور پر استعمال کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ کھڑی بولی، اس کی ہندی لغت۔ محاوروں اور جملوں کو سنوار کر پیش کرنے کی فطری ذہنیت اس شہریت سے پیدا ہوئی جس کی داغ بیل بھی مسلمان نے ڈالی تھی اور جسے مسلمان ہی پروان چڑھا رہے تھے۔ میں نے مثالاً جو اشعار اور مصرعے پیش کئے ہیں ان کے ٹھیٹھ یا ہندی حصّے ان میں ہندی کے لفظوں کا انتخاب و نشست یا در و بست ان کی فن کارانہ سادگی آسانی سے ہاتھ نہیں لگتی مشکل سے یا کوشش سے بھی یہ ہندی ہاتھ نہیں آتی۔ اگر گھریلو زندگی۔ قومی اور اجتماعی زندگی میں تزئین زبان کا جذبہ آبادی کی آبادی کو متاثر و متحرک نہ کرے جب کسی بولی کی

ادبی تہذیب و تالیف شروع ہوتی ہے تو قومی زندگی کے نازک ترین لطفی احساسات اور حساس ترین سلیقہ مندی اس عمل میں کارفرما ہوتے ہیں۔ بی بی، بچّوں، گھر والوں، نوکر چاکر، عزیزوں رشتہ داروں، برابر کے لوگوں بلکہ اپنے سے چھوٹوں اور اپنے سے بڑوں، سب سے مہذب گفتگو کے جو سانچے تیار ہو چکے ہیں۔ زبان کی جو روایتیں تیار ہو چکتی ہیں ان سب کو لیکر زبان آگے بڑھتی ہے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں سے اتنی عربی فارسی ضرور سیکھ لی جتنی اُردو شاعری کے لئے ضروری تھی بلکہ اس سے بہت زیادہ عربی فارسی سیکھ لی۔ لیکن جو چیز مسلمانوں سے وہ نہیں سیکھ سکے یا جس کا جلدی سیکھ لینا مشکل تھا وہ سنواری ہوئی ہندی تھی یا وہ ہندی کی ادبی شان تھی۔ مرزا تفتہ غالب سے زیادہ فارسی عربی اپنے اُردو کلام میں بھی بھرتے ہوں گے۔ لیکن جہاں جہاں غالب نے نرم اُردو یا ہندی نما اُردو لکھی ہے جہاں جہاں غالب نے کھڑی بولی کے معجزے دکھائے ہیں اس کی تقلید مرزا تفتہ سے نہ ہو سکی۔ بڑا مشکل کام ہے سہل اُردو ادبی

شان کی ہندی لکھنا اور اُردو والے جس بات پر جان دیتے آئے ہیں وہ بھی ہندی نما اُردو ہے یہی سہل اور ادبی شان والی ہندی ہے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست ۔

اگر اُردو کے معنی اُردو لغت یا اُردو ادب کا وہ حصّہ ہے جو عربی فارسی سے بنا ہے یا جو فارسی عربی عروض کے مطابق موزوں ہوا ہے تو یہ اُردو ہندوؤں کو آتی تھی لیکن اگر اُردو کا اصلی جوہر اُردو کی روحِ رواں کھڑی بولی کے ہندی الفاظ کی سجاوٹ ہے تو یہ اُردو صرف مسلمانوں کو آتی تھی اگرچہ کہ بکھری اور کھردری شکل میں یہ اُردو مسلمانوں نے ہندوؤں ہی سے پائی تھی۔ کھیت ہندوؤں کا تھا اسے شاداب کرکے لہلہاتا ہوا باغ بنانا ان مسلمانوں کا کام تھا جن کی سماجی زندگی اور اس کی روایتیں اور فطری رجحانات سب مل کر ان سے صرف کھڑی بولی نہیں بلکہ رچائی اور سنواری ہوئی کھڑی بولی بلواتی تھیں اکھڑ کھڑی بولی اور نرم و رواں دواں کھڑی بولی میں بڑا فرق ہے اس سماجی عمل میں برابر کی حیثیت سے ہندو مسلمانوں کے شریک کار نہیں

ہو سکتے تھے البتہ بہت تھوڑے سے ہندو اس کام میں مسلمانوں کے پُرخلوص مدّاح اور مُقلّد ضرور ہوئے۔ چکبست اور نسیم اور درگا سہائے سُرور اور سرشار! بنواری لال شعلہ یا نظر تک کی اُردو میں ہندی الفاظ اس لوچ اور معصومی و مانوسیت کے ساتھ نہیں آئے جس کی مثالیں غالب تک کے یہاں مل جاتی ہیں۔ غالب تک کے یہاں اس لئے میں نے کہا کہ غالب کی اُردو عموماً بہت مفرس کہی جاتی ہے۔ ان ہندو ادیبوں کی اُردو اُستادانہ سہی لیکن ان کی اُردو میں ایک پُرتکلّف خارجیت ہے یہ اُردو اپنی تمام شان و شوکت کے باوجود کتابی معلوم ہوتی ہے۔ سیکھی ہوئی اُردو معلوم ہوتی ہے۔ اسی سے چوٹی کے ادیب ہوتے ہوئے بھی اُردو غزل میں یہ لوگ نام نہ کر سکے۔ عربی دانی اور فارسی دانی کے باوجود غزل کی روح بڑی ٹھیٹھ چیز ہے۔ یہ ہندو ادبا اتنے مہذّب تھے کہ عاشق بھی نہ ہو سکے تھے پھر وہ ہندی نما عشقیہ اُردو کہاں سے لکھتے۔ جس کا جادو مہر و مومن نے جگایا ہے۔

اُردو کے ہندو ادیبوں کا مذہب مسلمانوں سے مختلف تھا لیکن اختلافِ مذہب ان کے اُردو میں نہ چمک سکتے یا مسلمانوں کی طرح نہ

نہ چمک سکنے کا سبب نہیں تھا۔ اُردو کے ہندو ادیبوں کی سماجی زندگی گھریلو زندگی۔ ان کی۔ ان کے بی بی بچّوں کی ان کے متعلقین کی بول چال مختلف تھی۔ لب و لہجہ مختلف تھا۔ ان کی کھڑی بولی اتنی رچی ہوئی نہیں تھی۔ اتنی رواں دواں نہیں تھی۔ اتنی سُتھری نہیں تھی جتنی ہزارہا مسلمان گھرانوں کی کھڑی بولی تھی۔ اس سے ان کی اُردو بولی میں ایک بھاری پن کا احساس ہوتا ہے جس طرح ہندوستان کے فارسی شعراء میں کی فارسی میں عموماً ایک بھاری پن کا احساس ہوتا ہے۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر۔ اُردو خارجی و داخلی طریقے سے حاصل کی جاتی ہے۔ اُردو کے ہندو ادیب اسے صرف خارجی طریقے سے حاصل کر سکتے تھے۔ اُردو کے مسلمان ادیب اسے داخلی انداز سے حاصل کر سکتے تھے یعنی اُردو کے اس اہم ترین حصّہ کو جسے دلّی و اطراف دلّی کے اسلامی تہذیب نے (مذہب نے نہیں) اجتماعی عمل سے بنایا اور سُنوارا تھا اور جو تمام تر کھڑی بولی کے ہندی الفاظ یا ان تھوڑے سے عربی فارسی الفاظ سے بنا تھا جو ان میں ہندی الفاظ گھُل مل گئے تھے اور جنھیں ہندو اسی آسانی سے بولتے تھے جسطرح مسلمان

یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اگرچہ کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل مسلمانوں کے ہاتھوں سانچے میں ڈھلی لیکن اس ترقی یافتہ شکل میں اسلامی عناصر کو کوئی دخل ہرگز نہیں ہے جیسے سائنس کی کوئی دریافت یا ایجاد یا اصول کسی قوم یا ملک میں جنم لے کر اس قوم یا ملک کی چھاپ سے آزاد رہتی ہے۔ بلکہ اردو کی وہ شکل جسے مسلمانوں نے رچایا اس کی زیادہ ہم آہنگی ہندو مزاج اور ہندو تہذیب سے ہے کیوں کہ اُردو کی اس شکل میں ہندی الفاظ کا لوچ ہے! اس کھڑی بولی کا لوچ ہے جو ہندوستان اور ہندوؤں کی چیز تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ شروع میں کسے ہندو سنوار نہیں سکتے تھے۔ لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ مسلمانوں کو جو کچھ اردو کو بنانا تھا وہ بنا چکے۔ اب اس کی بالکل ضرورت نہیں کہ دلّی یا لکھنؤ میں جاکر ہندو بسیں اور دن رات مسلمان ادیبوں کا منہ تاکتے رہیں۔ اُردو کتابوں اور رسالوں سے گھر بیٹھے اب استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اب اُردو پر ہندو فاتحانہ قبضہ کر سکتے ہیں۔ فصیح ترین اور بلیغ ترین اُردو میں ہندو تہذیب ویدوں اور اُپنشدوں کی تہذیب

کالی داس اور سنسکرت کے دوسرے شعراء کا کلچر ہندو بھر سکتے ہیں۔ نئی تہذیب ہندوستان کی 'نشاۃ ثانیہ' کی روح سب کچھ اُردو میں بھرا جا سکتا ہے۔ اُردو میں سَو فی صدی بھارتیتا (ہندوستانیت) بھری جا سکتی ہے۔ اُردو ادب کو اسی طرح ہندوستان کا ادب بنایا جا سکتا ہے جیسے جرمن ادب جرمنی کا ادب ہے یا کسی ملک کا ادب اس مُلک کا ادب ہے یا جیسے کالی داس اور ٹیگور کا ادب ہندوستان کا ادب ہے۔ کھڑی بولی کے تمام ہتھکنڈے اب بہ آسانی سیکھے جا سکتے ہیں۔ ہندو تہذیب اگر اُردو میں اپنے عکاسی کرنا چاہے تو اس تہذیب کی تابندگی اور اُردو کی موہنی میں کمی پیدا نہیں ہوگی۔ ضرورت کے مطابق اُردو لغت سے تال میل کھانے والے سازِ اُردو میں نئے پردے نکالنے والے سنسکرت الفاظ میں داخل کئے جا سکتے ہیں۔ اُردو کے ہندو ادیب اب اُردو کو خلافانہ طور پر برت سکتے ہیں۔ اب وہ وقت آگیا ہے اور اب ہندو اس قابل ہو گئے ہیں کہ مسلمان اُردو میں ہندوؤں کو بڑے حصہ دار (Senior Partner) کی حیثیت سے شریک کر لیں۔ نہ شریک کریں تو ہندو زبردستی اپنا حصہ لے لیں۔ ہندو سماج اب تک تو

میر۔ سودا اور غالب۔ انیس۔ اقبال کے ہم پلہ ادیب پیدا نہ کر سکا تھا۔ لیکن نئے اُردو ادب کی تخلیق و تعمیر میں ہندو سماج بڑے سے بڑے مسلمان ادیب کا حریف پیدا کر دے گا۔ نثر و نظم دونوں میں۔ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ اُردو ادب کی شوخیاں اب سادگی اور معصومی میں بدل چکی ہیں۔ اردو میں وہ مانوسیت وہ سیدھا سبھاؤ وہ بھاؤ اور رس اب آچلا ہے۔ اب ہندوستان کی اصلی روح اس طرح دبے پاؤں اُردو میں سما رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہندو سماج میں وہ ذہنی نشاۃ ثانیہ پیدا ہو گئی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ مقدار اور صفت تعداد اور مرتبہ یہ لحاظ سے ہندو آبادی اُردو ادب کی خدمت کرنے میں اپنی اکثریت کی داد دے سکے اور اُردو ادب کی ترقی میں پیشوائی اور رہنمائی کے فرائض ادا کرے۔

یہ ضرور ہے کہ اُردو کے مقابلے میں ہندی تحریک نے عام طور سے ہندوؤں کی توجہ دوسری طرف کھینچ لی ہے لیکن اگر ناگری حروف میں اب تک کے اردو ادب کا ایسا حصہ منتقل کر دیا جائے جس کی مثالیں میرے منتخب کردہ ایسے اشعار ما در مصرعوں میں ملتی ہیں جنھیں میں نے

اس مضمون میں کیا ہے تو اُردو ہندوؤں کی گھٹی میں پڑ جائے گی۔ ہندی بحروں، سنسکرت بحروں۔ اُردو شاعری میں جو نئے نئے قسم کے نظم پارے یا نئی نئی شکلوں کے منظوم بند (Stanzas) وضع کئے جا رہے ہیں۔ جدید ہندی شاعری میں جو بحریں یا جن جن شکلوں کے نظم پارے یا منظوم بند ڈھالے جا رہے ہیں یا ایسے الفاظ لائے جا رہے ہیں جو اُردو میں کھپائے جا سکتے ہیں۔ سنسکرت ادب تشبیہوں یا استعاروں یا بنگلہ ادب کی تعبیرات و طرز ادا اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کی خوبیاں ان سب سے اگر استفادہ کیا جائے تو اُردو میں بڑی وسعتیں پیدا ہو جائیں گی اور اس کی اُردوئیت میں کوئی کمی یا خرابی پیدا نہیں ہوگی۔ پھر ہندی تحریک کا سنگم پیدا ہو جائیگا اور ایک بہت بڑے ادب کی تعمیر شروع ہو جائے گی۔ اب تک کا اُردو ادب اور قدما کے شاہکار اس تعمیر میں بڑی مدد کریں گے۔ اُردو ادب کی بیکراں وسعتوں کے امکان پر اُردو ہی والے ذرا کم دھیان دیتے ہیں یہ بھی کیا ڈرپوک خیال ہے کہ دو ہزار کے قریب سنسکرت الفاظ اور کچھ نئی بحروں

اور وزنوں اور نئے نئے انداز بیان کو اُردو میں شامل کر لینے سے
اُردو کو نقصان پہونچے گا۔ شروع میں اس کی ضرورت
رہی ہو تو رہی کہ ذرا سکڑ اور سمٹ کر کھڑی بولی اپنی جھلک
دکھائے۔ اب اسے بے دھڑک اپنا گھونگٹ کھول دینا
چاہیئے۔

ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا؟

دیوتا اور فرشتے شاید کوئی کاروبار نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ شیطان کے بہانے سے آدم اور حوّا نے بہشت میں علم کے درخت کا پھل کھا لیا تو انھیں بہشت سے نکلنا پڑا اور دنیا میں آنا پڑا۔ بہشت میں انھیں بھی چھٹی ہی چھٹی تھی۔ لیکن جب ان کو دنیا میں آنا پڑا تو انھیں کام ہی کام نظر آئے۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر (اقبالؔ)

دنیا عجب جگہ ہے۔ چار دن کی زندگی لیکن پیٹ کے مارے ہوئے آدمی ہی نہیں بلکہ گھاس پودے اور پیڑ بھی چھوٹے چھوٹے کیڑوں اور پتنگوں سے لیکر کُل چرند اور پرند۔ شیر اور ہاتھی، پنچھی اور پکھیرو، جل تھل میں رہنے والے اور زمین کے نیچے رہنے والے جان دار سب کو پیٹ پالنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلانا پڑتا ہے، شہد کی

مکھیوں اور چینٹیوں کا حال تو آپ کو معلوم ہے۔

ایک آدمی نے اپنے مکان میں پانی کے نل کا راستہ بدل دیا نل کے پاس ہی ایک بڑی لتا لگی ہوئی تھی۔ اب تک تو یہ لتا اس طرف جڑ پھینکتی تھی جدھر زمین کے نیچے پانی کا نل گیا تھا لیکن اب لتا کی جڑیں نل کے نئے راستہ کی طرف بڑھنے لگیں۔ کچھ کئے دھرے بغیر درختوں کا بھی کام نہیں چلتا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک چور کو بھی آٹھ راجاؤں کی عقل ہونی چاہئے۔

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا (یگانہ)

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ہندوستان میں کن کن طریقوں سے لوگ پیٹ پالتے ہیں۔ کیا آج کا ہندوستان بھی سو برس پہلے کا ہندوستان ہے؟ اس کا جواب ہاں بھی ہے اور نہیں بھی۔ آج ہندوستان میں ۳۵ کروڑ آدمی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ سو برس پہلے تیس کروڑ کے لگ بھگ یہاں کی آبادی رہی ہوگی۔ ۱۵ کروڑ تھوڑی تعداد نہیں ہوتی کیا ہندوستان کی کمائی یا سالانہ پیداوار بھی سو برس کے اندر اسی

حساب سے بڑھی ہے ؟ ہرگز نہیں - اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اتنی نہ سہی لیکن ہندوستان کی سالانہ آمدنی سو برس میں ڈیوڑھی کے قریب ہو گئی ہے تو بھی اس سے وہ تھوڑے سے لوگ امیر بن گئے ہیں اور بنتے جاتے ہیں جو لکھپتی یا کروڑپتی ہیں اور جو ہزاروں کارخانوں یا بڑی بڑی جائدادوں کے مالک ہیں - اس لئے اگر سو برس پہلے سارے ہندوستان میں زیادہ ایک لاکھ لکھپتی تھے تو آج ڈیڑھ لاکھ لکھپتی یا بہت ہی امیر آدمی ہوں گے لیکن ۱۵ کروڑ آبادی بڑھ گئی اور اگر دولت بھی کچھ بڑھی تو وہ کُل کی کل پچاس ہزار لکھپتیوں میں اور اسی طرح ایک کروڑ کے قریب چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے والوں میں بٹ گئی - اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سو برس پہلے جتنی آمدنی میں بیس کروڑ گذارا کرتے تھے اسی آمدنی میں آج قریب ۳۳ کروڑ آدمی جی رہے ہیں یا مر رہے ہیں - اس کا پتہ بڑے بڑے شہروں کی ٹیم ٹام اور ٹھاٹ باٹ دیکھ کر نہیں چلتا بلکہ ہندوستان کے ان پانچ کروڑ جھونپڑوں کو دیکھ کر چلتا ہے جن کے بسنے والے جان لڑا کر محنت کرنے پر بھی پیٹ بھر کھانا اور بدن ڈھکنے کو پورا کپڑا نہیں پاتے یہ بُری حالت پہلے اگر

سات آٹھ کروڑ ہمارے ہموطن بھائیوں کی تھی تو آج یہ حالت بیس کروڑ سے زیادہ مردوں، عورتوں اور بچّوں کی ہے۔

اچھّا اب ہم اور آپ دیکھیں کہ ہمارے کاروبار کیا ہیں۔ سب سے پہلے تو ہماری نظر ان لوگوں پر پڑتی ہے جن کا صرف ایک کام ہے یعنی "رام رام جپنا پرایا مال اپنا" رام نام جپنے کا حال تو رام جانیں لیکن ان کے نزدیک پرایا مال اپنا ضرور ہے۔ بھارت ماتا سچ مچ یہ کہتی ہے کہ

"ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے"

میں تھوڑے سے فقیروں کو تو کچھ نہیں کہتا لیکن وہ لوگ جنھوں نے زبردستی اپنا کاروبار بیکاری بنا رکھا ہے۔ آج ایک کروڑ کی تعداد میں ہیں۔ گنبھ کے میلوں میں الہ آباد کے سنگم پر یا ہردوار میں یا ایسے ہی دوسرے اشنانوں پر یا تیوہاروں میں مشہور تیرتھ گاہوں پر جاکر دیکھئے سادھوؤں کے جتھے، ناگا سادھوؤں کے اکھاڑے جن میں بیسوں ہزاروں بلکہ لاکھوں عورتیں بھی ہوتی ہیں اور جن کے جتھے اور اکھاڑے الگ ہوتے ہیں۔ یہ لاکھوں بیراگی اور بیراگنیں دَل کے دَل اُمنڈتے ہوئے

طوفان کی طرح آپ کو نظر آئیں گے۔ ناگوں کو دیکھئے بالکل مادرزاد ننگے ہوتے ہیں کوئی موسم ہو ایک سوت ان کے بدن پر نظر نہ آئے گا۔ صرف راکھ سارے بدن پر نظر آئے گی۔

"یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا"

اس گروہ کی عورتیں ضرور ایک ہاتھ چوڑا گیروا کپڑا کمر پر اور فٹ بھر سے کچھ کم چوڑا کپڑا سینے پر لپیٹے رہتی ہیں۔ اسی طرح انوکھے اور نرالے روپ رنگ والے لاکھوں سادھو ملیں گے جن کے یا تو سر مُنڈے ہوئے ہیں یا پھر جن کی جٹائیں برگد کے پیڑ سے لٹکنے والی جڑوں یا بڑ دھوں کی طرح یا بٹی ہوئی رسّی کی طرح کبھی کھُلی ہوئی اور کبھی بندھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ باہوں پر اور ماتھوں پر سینکڑوں طرح کے نشان یا گُلکاریاں چندن سے یا گیرو سے یہ کر لیتے ہیں کسی کے ہاتھ میں ترشول ہے تو کسی کے ہاتھ میں صاف سُتھری اور سُبک کُلہاڑی یا فالسہ (پھرسا) ہے یا ہاتھ میں کوئی بانسری ہے یا دوسرا باجا ہے یا اور کچھ نہیں تو رنگے ہوئے سوٹے ہیں یا سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے چھوٹے چھوٹے کالے ڈنڈے ہیں یا بغل میں مرگ چھالا ہے یا آسنی ہے یا کوئی جھنڈا یا پتاکا ہے

پھر اُن سنیاسیوں کو دیکھئے جو سر سے پاؤں تک گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ یا چادر لپیٹے ہوئے ہیں۔ جن پر رام نام لکھا ہوا ہے پھر ان پنڈتوں پجاریوں مہاتماؤں اور مہنتوں کو دیکھئے جن میں کچھ تو غریب ہیں اور کچھ لاکھوں اور کروڑوں روپوں کی جائداد کے مالک ہیں۔ لاکھوں مرد، عورت ان پر کروڑوں روپوں کا چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں دُرگا کے گنڈ پر
اَوتار بن کے کودے ہیں پریوں کے جھنڈ پر (انشا)

بہرحال ایک کروڑ فقیر سادھو پجاری اور بھیک منگے اس دیس میں موجود ہیں لیکن ان کی روحانی طاقت جو بھی ہو بھوک کی طاقت یا ہاضمہ کی طاقت میں بھی یہ بڑے سورما ہوتے ہیں اور گاما پہلوان سے کم نہیں ہوتے۔ یاد رکھئے یہ ہوا پی کر نہیں رہتے۔ شراب، گانجا، چرس، افیون، بھنگ سبھی کچھ ان کو چاہئے اور اس طرح یہ ایک کروڑ آدمی بغیر کچھ کئے دھرے صرف دو ارب روپے یعنی دو سو کروڑ روپے سال بسال کھا جاتے ہیں۔ سر تیج بہادر سپرو کا قول ہے کہ ہمارے

ملک کا سب سے بڑا کاروبار سب سے زبردست انڈسٹری یہی پیری مریدی
مہنتی اور بھیک منگائی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہمارے یہاں تعلیم کے لئے
روپیہ نہیں، کارخانے کھولنے کے لئے روپے نہیں۔ سڑکوں اور نہروں
کے لئے روپے نہیں۔ مزدوروں اور کسانوں کی حالت سدھارنے
کے لئے روپے نہیں۔ زبردست ہندوستانی فوج تیار کرنے کے لئے
روپے نہیں۔ اسپتالوں کے لئے لائبریریوں کے لئے، سائنس کی
ترقی کے لئے کسی کام کے لئے روپے نہیں۔ لیکن دو ارب روپے
ہر سال پھینکنے کے لئے موجود ہو جاتے ہیں۔ کیا یہی ہندو اور مسلم
کلچر ہے؟ ہاں یہی ہندو اور مسلم کلچر ہے'۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

اب ہمارے ہندوستان کی اس آبادی پر نظر ڈالئے جس کی
تعداد بیس اور پچیس کروڑ کے بیچ میں ہے۔ یعنی کسان اور کھیتوں
میں مزدوری کرنے والے۔ ہماری کھیتی باڑی بھی اب وہ نہ رہی
جو سو برس پہلے تھی۔ ایک تو آبادی قریب قریب دوگنی ہو گئی کھیتوں
پر بوجھ زیادہ بڑھ گیا جس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ لاکھوں ایکڑ زمین جہاں
ہمارے گائے اور بیل اور دوسرے جانور بے فکر ہو کر چرتے اور تیار

ہوتے تھے اس پر بھی ہل چل گئے، دوسرے یہ ہُوا کہ اس بلے چوڑے مُلک میں علاوہ اناج کے پہلے کروڑوں روپے کا سالانہ گُڑ اور شکر خرچ ہوتا تھا۔ شکر پہلے چند سال تک تو باہر سے آنے لگی تھی اور ہندوستانی کارخانوں میں بنتی ہے گُڑ البتہ ابھی تک بہت کچھ دیہات میں بنتا ہے۔ لیکن جب شکر بھی گاؤں یا قصبوں کے چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں بنتی تھی تو اس سے کروڑوں دیہاتیوں کو سالانہ اچھی خاصی آمدنی تھی۔ سب سے بڑی مصیبت جو ستّر اسّی فی صدی آبادی پر آئی ہے وہ ہر گھر میں کپڑوں کے لئے سوت کاتنا بند ہو جانے سے آئی ہے اور دیہاتوں میں کپڑے بُننے کے بند ہو جانے سے آئی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک کسان کا گھرانا یا دیہاتی مزدور کا گھرانا کتنا دِلدّر اور کنگال ہوتا ہے۔ اسّی نوّے فی صدی کسان اور مزدور زندگی بھر میں ایک بار بھی دس روپے اپنا سمجھ کر ہاتھ میں نہیں لیتے اور اگر دیہاتوں میں سوت کاتا جاتا اور کپڑے بُنے جاتے تو ہر سال بیسوں روپے ہر گھر کی آمدنی یا بچت ہوتی۔ آج سے سَو برس پہلے جو کھیتی یا گرہستی کا مطلب سمجھا جاتا تھا

وہ مطلب آج نہیں رہا۔ رات گئی بات گئی۔ اب تو گھٹیا قسم کا تھوڑا سا اناج پیدا کر لینا ہی ان کی گرہستی رہ گئی ہے اس سے گھر بھر کو سال بھر کھانا بھی پیٹ بھر کر نہیں ملتا اور گھی، دودھ، تیل، ترکاری تو عمر بھر سپنے میں بھی نصیب نہیں۔ یہاں تک کہ لال کالی مرچ یا کسی قسم کا مصالحہ اور نمک بھی پورا نہیں ملتا۔ عمر بھر بلکہ پُشت در پُشت یا غلط اصطلاح میں نسلاً بعد نسلاً یہ قرض سے لدے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی بہت کم کمائی کا بڑا حصّہ مہاجن لے لیتا ہے اور عمر بھر مُفت نوکری یا بیگار اُن کو کرنی پڑتی ہے۔ مویشی ایک آدھ ادھ مری بیل کے سوا یہ رکھ نہیں سکتے اور گھر بھر میں ایک آدھ آدمی سال بھر میں صرف ۶ یا ۷ مہینے بیگھے دو بیگھے کھیتوں میں کام کرتے ہیں باقی عمر بھر جھینکتے ہیں یا جھک مارتے ہیں۔

صرف ادھ مری کھیتی پر پیٹ کاٹ کر گذارا کرنے والوں کے علاوہ دیہاتوں میں ایسی قومیں بھی بستی ہیں جو کھیتی کے ساتھ اور کام بھی کرتی ہیں جیسے بڑھئی، لوہار، دھوبی، نائی، گڈریئے، کُمھار، چمار، بھڑبھونج، ملّاح اور ایسی ہی دوسری قومیں بھی، ان میں سے آپ نے

بہنوں کی زندگی، کاروبار اور اُن کی زندگی اور کاروبار سے متعلق مذہبی یا دوسری طرح کی راہ ورسم کو یا رِیت رواج کو اچھی طرح دیکھا ہوگا مَیں تو نہیں جانتا کہ مذہب کس کو کہتے ہیں۔ آپ جانتے ہوں گے کہ مذہب کس کو کہتے ہیں۔ لیکن مذہب کی وہ بنی ہوئی یا بگڑی ہوئی اصلی یا نقلی، سچّی یا جھوٹی شکل جو رِیت رواج کی شکل میں نظر آتی ہے وہ ہندوستانیوں کی رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ مکان بنانے میں کنواں کھودنے میں، باغ لگانے میں، ہر قسم کی فصل بونے اور کاٹنے میں طرح طرح کے رِیت رواج برتے جاتے ہیں۔ مجھے دیہات میں اپنا لڑکپن یاد آتا ہے۔ ہم لوگ گورکھپور شہر سے اپنے بزرگوں کے جنم بھوم موضع بنوار پار میں چُھٹّیاں منا رہے ہیں۔ کھیتوں میں ایکھ بوئی جا چکی ہے۔ چاند کی ایک خاص تاریخ ہے۔ سُہانی رات ہے۔ گاؤں کی تمام کنواری لڑکیاں غریب اور امیر زمیندار، کسان، مزدور ہر ذات کی لڑکیاں گھر سے نکل کر چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا لیتی ہیں۔ اور گاتی ہوئی ایکھ کے کھیتوں میں پہونچ جاتی ہیں، ان کے ساتھ صرف دس بارہ برس تک کے لڑکے جا سکتے ہیں، مردوں کو حق

نہیں ہے کھیتوں میں جاکر سب لڑکیاں بیچ کھیت میں دوڑ کر اونچا سے اونچا کودتی ہیں اور اس ہائی جمپ (High Jamp) میں جتنا اونچا کودیں گی بشواس کیا جاتا ہے کہ فصل بھی اتنی ہی اونچی اُگے گی۔ جی نہیں چاہتا اس رنگین حسین اور بھولے خیال کے سچ یا جھوٹ ہونے کی بحث میں پڑیں یہ ہماری سماجی زندگی کی شاعری ہے اور اس شاعری پر ہزاروں غزلیں اور قصیدے قربان۔ دیہات کی زندگی دفتروں اور کارخانوں، شہروں کی عام زندگی نہیں ہوتی جس میں کام اور چھٹی میں ہفتہ کے چھ دن اور اتوار میں میل یا لگاؤ نہ ہو۔ دیہات میں لوگ کاروبار ہی میں چھٹی منانے کے بھاؤ (Holi day spirit) بھی پیدا کر لیتے ہیں آپ شاعری میں درس عمل چاہتے ہیں۔ دیکھئے ان ریت رواجوں نے شاعری کو عمل بنا دیا ہے۔ اور عمل کو شاعری بنا دیا ہے یا نہیں؟ کھیت کٹ رہے ہیں لیکن گانا بھی گایا جا رہا ہے۔ مکان کی چھت یا کنوئیں کی جگت پیٹی جا رہی ہے لیکن گا گا کے پیٹی جا رہی ہے۔ دھوبی کپڑے دھو رہا ہے لیکن گا گا کے دھو رہا ہے۔ پاسی تاڑ پر تاڑی اُتارنے کو اپنی جان پر کھیل کر چڑھ رہا ہے لیکن آس پاس

کے مکانوں کی بہو بیٹیوں کو آواز دیتا ہے اور پردہ پکارتا جاتا ہے
اور اس کی للکار میں ایک اُبھار ہے ایک ولولہ ہے۔ یہ آواز ہمیں کچھ
بھیانک بھی اور کچھ دل کھینچنے والی بھی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے سُنا
ہے کہ چور بھی چوری کی دیوی کی بڑے ٹھاٹ باٹ سے پوجا کرتے
ہیں اور چوری کرنے یا سیندھ مارنے کے پہلے دیوی دیوتا کو منا لیتے
ہیں کیا عجب کہ چوری کے متعلق ان کے خاص خاص گانے ہوں۔
پسنہاریوں کے گانے تو آپ کے گاؤں میں بھی گائے جاتے ہونگے۔
اور جب اناج اوکھلی میں کوٹا جاتا ہے اس وقت بھی موسل کی پوح دار
مگر بھرپور چوٹ کے ساتھ ساتھ پورے بدن اور ہاتھوں کے چڑھاؤ
اور اُتار کے ساتھ ساتھ گانے گائے جاتے ہیں اور یہ جھوٹی عاشقانہ
یا غیر عاشقانہ شاعری نہیں ہے بلکہ سماجی زندگی اور کاروباری زندگی
کی تصویریں ان گیتوں میں ہوتی ہیں۔ ہمارے صوبے میں نٹوں کی
ایک قوم ہوتی ہے ان کی عورتیں گھر گھر جاکر عورتوں کے ہاتھوں
پر گودنے گودتی ہیں جس کو انگریزی میں Tattooing کہتے ہیں۔
برسات کے شروع میں یہ نکلتی ہیں جس کے گودنا گودا جاتا ہے وہ

روتی جاتی ہے لیکن نٹنیں گودنے گودتی جاتی ہیں اور گاتی جاتی ہیں۔ یہ گیت آپ نے بھی سُنا ہوگا۔ "آئے ساون کے مہینوا گوری گودا لے گودنا" نٹ آلھا اُودل کی لڑائی کے گیت گاتے ہیں اس گیت کو آلھا کہتے ہیں اور یہ بڑی جوشیلی نظم ہے۔ یاد رہے کہ مہابھارت اور فردوسی کا شاہنامہ پڑھکر رگوں میں خون اس طرح جوش نہیں مارتا جتنا آلھا سُن کر دیہاتی بہادری کے بھاؤ سے بیتاب ہو جاتا ہے۔ آلھا کا لکھنے والا لکھتا ہے کہ "گھمسان کی لڑائی ہوتی ہے۔ کھُل کر تلوار چلی ہے، کٹی سر کٹ چکے ہیں لیکن بے سر کے آدمی اور بے سر کے گھوڑے، بے سر کے ہاتھی گھوم رہے ہیں اور ناچ رہے ہیں"۔ کتنی سچی تصویر ہے۔ لیکن ہمارے شاعروں کا رقص بسمل یا بسمل کی تڑپ اس ناچ کو پا سکتے ہیں۔ نٹ صرف بہادری کے گانے نہیں سُناتے بلکہ کُشتی، کثرت اور گدکا پھری کی تعلیم بھی دیہاتیوں کو دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہد بھی نکالتے اور بیچتے ہیں۔ غرض کہ ہماری سماجی اور کاروباری زندگی میں ہر کام کے لئے گیت ہیں، ریت رواج ہیں اور الگ الگ پوجا ہے ہر کام، ہر پیشہ کا خاص دیوتا ہے یا خاص دیوی ہے۔ ابھی تو نہ جانے

کتنے کاربار ہیں جن کا نام تک نہیں آیا۔ بانس کی اور بینت کی کرسیاں، چق، الماریاں، میزیں، ٹوکریاں بنانے کا کام جسے کرنے والے بنس پھوڑ کہلاتے ہیں۔ سنپیرے جو سانپ پکڑتے اور سانپ دکھاتے ہیں۔ بندر اور بھالو نچانے والوں کو کس نے نہیں دیکھا ہے۔ ٹھٹھیرے جو معمولی سے معمولی برتن سے لیکر قیمتی سے قیمتی برتن بناتے ہیں۔ اسی سلسلے میں بنارس میں پیتل کا وہ کام اور وہ نقاشی جس کا جواب آج بھی دُنیا بھر میں نہیں ہے۔ مُراد آباد کے برتنوں کا کام، تمباکو ساز اور تمباکو فروش، حلوائی یوں تو سارے مُلک میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن خاص طور پر بھی کہیں کہیں کی مٹھائی مشہور ہے جیسے سندیلے کے لڈّو۔ متھرا کے پیڑے۔ قنّوج کا عطر۔ غازی پور کا گلاب۔ جونپور کا تیل۔ مَؤ اور ٹانڈے اور مگھر کا کپڑا سی مگھر میں کبیر صاحب کا مقبرہ ہے۔ لکھنؤ کی چکن۔ فرّخ آباد کی چھپائی مُظفّر نگر کے کمبل۔ مرزا پور کے قالین اور آگرہ کے قالین یہ سب مشہور ہیں۔ چُنار کے مٹّی کے برتن۔ لکھنؤ اور بنارس کے کھِلونے اور ایسی ہی کئی چیزیں فیض آباد کے صندوق۔ نین پوری کے کھڑاؤں۔ نگینہ میں آبنوس کا

کام۔ بریلی میں شیشم کی چیزیں۔ ڈوم بھی علاوہ میلا صاف کرنے کے سُوپ اور جھاڑو بناتے ہیں اور بیچتے ہیں اور چندر گرہن اور سورج گرہن میں خیرات بھی پاتے ہیں کیونکہ بغیر ان کو خوش کئے چاند اور سورج راہو اور کیتو کے چُنگل سے چھوٹ نہیں سکتے مسلمان مہتر بھی علاوہ صفائی کرنے کے شادیوں میں اور خوشی کے دوسرے موقعوں پر شہنائی بجاتے ہیں، مہترانیاں کتنی خوبصورت ہوتی ہیں۔ آپ اسے نہ جانتے ہوں تو جوش ملیح آبادی کی کٹی نظم مہترانی پڑھ لیجئے۔ ہر ذات نے ایک ایک کام اپنے لئے مقرر کر لیا ہے اور پُشتہا پُشت سے وہی کام کر رہے ہیں۔ کیا آج جسے ہم ٹریڈ یونین کہتے ہیں اور جسے پہلے یورپ میں ٹریڈ گلڈ کہتے تھے ذات کہیں وہی چیز تو نہیں ہے۔ نئی چیزیں بھی کتنی پُرانی ہیں۔ سچ مچ یہ دُنیا گول ہے۔ یہ صرف جغرافیہ میں نہیں لکھا ہے بلکہ تاریخ یا سماج کی زندگی بھی یہی بتاتی ہے۔

سو برس کے اندر ہندوستان جتنا بدلا ہے اس کا نظارہ شہروں کے کارخانوں میں، ریل میں، موٹر میں، سرکاری دفتروں اور عدالتوں

میں، انگریزی اسکولوں، کالجوں، چھاپہ خانوں میں تو ضرور نظر آتا ہے۔ حالانکہ عمارتوں، مشینوں، ٹائپ رائٹروں، بجلی کے پنکھوں، روشنیوں، خس کی ٹٹیّوں اور دو چار ذرا اچھی یا بہت اچھی تنخواہ والے افسروں کے علاوہ خدا کی دُنیا یہاں بھی پھٹے حالوں دکھائی دینگے۔ مویشی خانے کے ایک منشی جی تھے جلدی میں اپنا تعارف وہ ایک بار یوں کرا گئے کہ "منشی خانے کا مویشی ہوں" بس یہی حال ہمارے دفتروں یعنی ہر "منشی خانے" کا ہے اور چھوٹی تنخواہ پر پسائی کرنے والے کلرک واقعی منشی خانے کے مویشی ہیں خیر لیکن دیہاتوں اور قصبوں پر تو اس ظاہری چمک دمک کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی دیہات والے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ

حُسن چمک گیا تو کیا۔ بوئے وفا تو اُڑ گئی
اس نئی روشنی نے آہ دل کا کنول بجھا دیا (یگانہ)

ہندوستان کے نوے فیصدی آدمیوں پر اگر کوئی پرچھائیں پڑی ہے تو انھیں بربادیوں کی پرچھائیں پڑی ہے جن کا کچھ حال ہم بیان کر چکے ہیں۔

یہ دھندلی پرچھائیاں ہیں جس کی دبی دبی گرمیاں ہیں جسکی
وہ شب قیامت کی رات ہوگی وہ روز روزِ شمار ہوگا

اِس سے زیادہ آج اتوار ہے۔ دفتروں کا حال مَیں بیان نہ کروں گا۔ آج "تو کچہری بند دفتر میں میاں اتوار بیٹھے ہیں"۔ آج تو دفتر والوں کو اپنا کاروبار بھول لینے دیجئے۔ مانا کہ وہ کاروبار ان کا معشوق ہے لیکن معشوق کی یاد بھول جانا وہ نعمت ہے جو مجنوں کو بھی اخیر عمر میں ملی جب اس نے لیلیٰ کو دیکھ کر انا لیلیٰ کہا اور نہ مَیں اس "کاروبار" کا ذکر کروں گا جس کی بدولت بقول غالب

"ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا"

اور جسے اس ساری مہذب اور با مذہب دنیا میں "نسلاً بعد نسلاً" ہماری بہت سی بدنصیب بہنیں کرتی آئی ہیں یعنی وہ کاروبار جو دُنیا کا سب سے پُرانہ پیشہ بتایا جاتا ہے۔

عشقیہ شاعری کی پرکھ

جنسی یا شہوانی محرّکات کا شعر میں اظہار عموماً عشقیہ شاعری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جس طرح کوئلے کو ہیرا نہیں سمجھا جاتا (اگرچہ کوئلہ ہی مدّت دراز میں آفتاب کی تابندگی اپنے اندر جذب کر کے ہیرا بن جاتا ہے) اُسی طرح شہوانی یا جنسی جذبہ جب تک وہ عشق کے عناصر اپنے اندر جذب نہ کرلے، عشقیہ جذبہ نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح محض جنسی یا شہوانی محرّکات کا شعر کے سانچے میں ڈھل جانا عشقیہ شاعری نہیں ہے۔ محض شہوانی یا جنسی اشعار اور عشقیہ اشعار میں تمیز کر سکتا، تنقید کا بڑا نازک و اہم مسئلہ ہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ یہ فرق کہاں موجود ہوتا ہے تو میں کہوں گا کہ بسا اوقات یہ فرق شعر کے لہجہ میں یا شعر کی صوتی فضا میں موجود ہوتا ہے۔ مثلاً غالب کا یہ شعر بادی النظر میں عشقیہ شعر سمجھا جائے گا۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

لیکن غالب کے اس شعر کا لہجہ حقیقی معنی میں عشقیہ شعر کا لہجہ نہیں ہے۔ غالب کا شعر تیز و طرار قسم کا جنسی شعر ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسی مضمون کو جب یوں ادا کیا جائے:

اِک چیز ہے دُنیا میں تقدیرِ محبّت بھی
سب کہنے کی باتیں ہیں اعجاز و مسیحائی

تو شعر کی فضا عشقیہ شاعری کی فضا ہو جاتی ہے۔ یا غالب کی اسی غزل کا یہ شعر ہے:

چال جیسے کڑی کماں کا تیر　　دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

حقیقی عشقیہ شاعری نہیں ہے، اور اس کے مقابلہ میں میر کا یہ شعر:

کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ　　سو تم ہم سے مُنہ ہی چھپا کر چلے

حقیقی عشقیہ شاعری ہے۔

کسی کا شعر ہے:

اِدھر آؤ زلفوں کے لٹکانے والے　　مرے دل کو گلیوں میں اٹکانے والے

لیکن اسی مضمون کا یا اسی موضوع پر اگر آپ کو عشقیہ شعر کی تلاش ہے تو ہم آپ کو غالب کا یہ شعر سُنائیں گے:

تُو اور آرائشِ خمِ کاکل میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

داغؔ کا یہ شعر بھی غالبؔ کے مندرجہ بالا شعر کے مقابلے میں عشقیہ شعر کہلانے کا مستحق نہیں۔

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

حسرتؔ موہانی کے یہ اشعار:

اے عشق کی بیباکی کیا تو نے کیا اُن سے

جس پر اُنھیں غصّہ ہے، انکار بھی حیرت بھی

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا لے گی

اے حسنِ حیا پرور، شوخی بھی شرارت بھی

عشقیہ اشعار ہیں، لیکن بلند نہیں۔

معاملہ بندی اور ادا بندی کی شاعری ہوتی ہے بہت دلکش لیکن آفاقی وسعتیں اُس میں نہیں ہوتیں، دنیا کے بڑے عشقیہ شاعروں کے یہاں معاملہ بندی اور ادا بندی کے اشعار اُن کے کلام کے اہم ترین اجزا نہیں ہیں۔ اب سے تیس برس پہلے کی بات ہے، ابھی میں سن شعور کو پہونچا ہی تھا کہ نہایت شد و مد کے ساتھ کچھ لوگوں

نے نظام رامپوری کا یہ مشہورِ عالم شعر مجھے سنایا:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مُسکرا کے ہاتھ

اور انور دہلوی کا یہ شعر بھی جو مندرجہ بالا شعر سے کم مشہور نہیں:

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

اور ایک مدّت تک میں بھی ان اشعار کا کلمہ پڑھتا رہا۔ لیکن میرے دل میں ان اشعار کے متعلق ایک دبا دبا چور تھا میرا وجدان ان اشعار سے جہاں ایک طرف متکیّف ہوتا تھا وہاں دوسری طرف کچھ مجروح بھی ہوتا تھا۔ لیکن اس ناآسودگی کا سبب ذرا بعد میں سمجھ میں آیا کہ دونوں اشعار میں اُن کے محاسن کے باوجود کچھ کمی بھی تھی اور وہ یہ کہ معشوق اور معشوق کی حالت سے ہمدردی ہم آہنگی کا جذبہ یا احساس ان اشعار میں نہیں ہے، بلکہ ہجو ملیح اور خفیف کا سا انداز واسوخت کا پیدا ہو گیا ہے۔ جہاں تک پہلے شعر کا تعلق ہے میں ایک بات اور بھی کہہ دوں اور وہ یہ کہ معشوق کے لئے ضمیر کے صیغہ غائب کو جمع میں لانا معشوق سے مغائرت

یا غیرت کا اظہار ہے۔ یہ طرز بیان اہل لکھنؤ کی چیز ہے اور میری نظر میں پسندیدہ نہیں۔

میرؔ کے بہترین عشقیہ اشعار کا تصوّر کیجئے، اور غالبؔ و مومنؔ کے بھی اُن اشعار کا تصوّر کیجئے جو اُن کے کلام میں عشقیہ شاعری کے شہ پارے ہیں۔ اس کے بعد ذرا متوازن دل و دماغ سے آتشؔ کے بہترین عشقیہ اشعار یاد کیجئے۔ اُس کی

"تار تارِ پیرہن سے آ رہی ہے بوئے دوست"

والی غزل، یا

"نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری"

والی غزل، یا

"آئینہ سینۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا"

والی غزل کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ اگر آتشؔ نے اپنے بہترین رنگ کی عشقیہ شاعری کے امکانات کو کچھ اور چمکایا ہوتا، اور اپنے رنگ میں ساٹھ ستّر بہترین عشقیہ غزلیں کہہ ڈالتا تو بلند تنقید کی نظر میں غالباً آتشؔ، غالبؔ اور مومنؔ بلکہ میرؔ سے بھی بڑا عشقیہ شاعر

کہلائے جانے کا مستحق ہو جاتا۔

میر و مومن کی عشقیہ شاعری کی عظمتیں مسلّم، لیکن دونوں کے کلام میں مُفکّرانہ اور رچے ہوئے سوز و سازِ نشاط کا فقدان ہے غالب کے یہاں نشاط کا عنصر کہیں کہیں جگمگاتا ہوا ضرور نظر آتا ہے، اور "مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے" والی لافانی غزل کے انداز میں غالب سے اگر تیس[۳] چالیس[۴] غزلیں ہو گئی ہوتیں تو اُردو کی عشقیہ شاعری نہ جانے کہاں پہونچ گئی ہوتی۔ یہ غزل اور "ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے" والی غزل غالب کی عشقیہ شاعری کے بہترین شاہکار ہیں۔ ان میں ایک نشاطیہ رنگ کا شاہکار ہے اور دوسری المیہ رنگ کا۔ غالب کی ہر دل عزیزی اُس کی مسلّمہ مقبولیت، سدا بہار چیزیں ہیں لیکن خالص عشقیہ شاعری کا بہت بڑا شاعر غالب نہیں ہے۔ غالب کے یہاں معیاری نظر سے دیکھنے پر کئی چیزوں کی کمی نظر آتی ہے۔ اگرچہ ایسا کہتے ہوئے دُکھ ہوتا ہے۔ لیکن تنقید کو کبھی کبھی شاعر اور نقّاد دونوں کے ساتھ بیدردی برتنی پڑتی ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ

عموماً محبوب کے متعلق غالب کا لہجہ غیریت اور استہزا کے عیب سے پاک نہیں رہ سکا ہے۔ کسی اچھے سے اچھے مذاق رکھنے والے آدمی سے آپ غالب کی شاعری کے بارے میں رائے پوچھیں تو وہ وجد آفریں لہجہ میں غالب کا ذکر کرے گا اور ایسا کرنے میں حق بجانب ہوگا۔ لیکن اگر اُسی شخص سے آپ اُردو کے بلند ترین اور بہترین عشقیہ اشعار سُنانے کو کہیں تو وہ میرؔ، مومنؔ کے اشعار سُنانے لگے گا اور ممکن ہے کہ غالب کے صرف دو ہی تین اشعار پر اکتفا کرے بلکہ اس کا بھی احتمال ہے کہ غالب کا ایک شعر بھی نہ سُنائے۔

عشقیہ شاعری کے معاملے میں آفاقی کلچر کی نظر بہت بلند ہوتی ہے اور آفاقی کلچر کے مطالبے بڑے مطالبے ہوتے ہیں، نظم کی عشقیہ شاعری ہو یا غزل کی، آفاقی کلچر کی کسوٹی پر بالکل ناقص تو ثابت نہ ہوگی لیکن بلند ترین چیز بھی نہ ثابت ہوگی۔ جو لوگ اُردو سے دلچسپی رکھتے ہیں اور عشقیہ شاعری سے بھی، اُن کے لئے بہت ضرورت ہے کہ اُردو کی عشقیہ شاعری کے تمام محاسن کو جانیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہماری تمام شاعری کا نوّے

فی صدی حصہ جنسی، شہوانی یا عشقیہ ہے۔ اور انگریزی، فرانس اور جرمنی کی شاعری کا صرف دسواں حصہ جنسی یا عشقیہ ہے انگریزی زبان کے کئی چوٹی کے شاعروں نے عشقیہ شاعری بہت ہی کم کی۔ جیسے ملٹن، ورڈسورتھ، کولرج، شیلی، کیٹس، میتھو آرنلڈ وغیرہ پھر بھی یہ حقیقت ہمیں یقین کر دینے کے لئے کافی ہے کہ بحیثیت مجموعی مغرب کی بلند ترین عشقیہ شاعری اُردو کی بہترین عشقیہ شاعری سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔

اُردو شاعری نے ہندوستان میں جنم لیا، یہیں پنپی اور پروان چڑھی۔ لیکن کالیداس، بھوبھوتی، بھرتھری اور دوسرے سنسکرت شعرا کی عشقیہ شاعری نے جن کے مذاقوں کو رچایا ہے، ودیاپتی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے شعرا کی عشقیہ شاعری نے جن کے مذاقوں کو رچایا ہے، ودیاپتی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے شعرا کی عشقیہ شاعری، ٹیگور کی عشقیہ شاعری نے جن کے وجدان کو متاثر کیا ہے، سیتا، ساوتری شکنتلا، دمینتی، رادھا، تارا، سلوچنا، پاروتی کے جگمگاتے

ہوئے تصوّرات نے جن کے دل و دماغ کو منوّر کیا ہے جنھوں نے ہندوستان کی عشقیہ شاعری میں سورگ کے سنگیت سُنے ہیں، اُن کے سامنے ہم اُردو کی بہترین عشقیہ شاعری پیش کرتے ہوئے، ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ یہاں نقّاد کا فرض محض ادبیّت یا لوازمِ فن سے گزر کر زندگی کے اُن مسلمات سے اپنے آپ کو رُوشناس کرنا ہوتا ہے جن کے بغیر بُنیادی تنقید ممکن نہیں۔

جنسی کشش اور جنسی رُجحانات میں جب تک جذباتی پائندگی جذباتی سوز و ساز، نرمی، مانوسیّت اور معصومیّت، حیرت و استعجاب سپردگی، وجدانی محویت اور ایک احساس طہارت کے عناصر گھُل مِل نہیں جائیں گے اُس وقت تک تخیّل میں وہ حلاوت اور وہ عنصری طہارت پیدا نہیں ہوگی جو بلند پایہ عشقیہ شاعری کو جنم دیتی ہے اور غم و محبّت کی کسک میں خیر و برکت کی وہ صفت بھی پیدا نہ ہوگی جس کے بغیر وہ رَس جَس یا "پرساد گن" پایا جائے گا۔ جہاں غم و نشاط کا اتحاد ہوتا ہے اور جو دُنیا کی بلند پایہ عشقیہ شاعری کی روحِ رواں ہے۔

ہندوستان کی روح نے صدیوں کی ریاضت کے بعد وہ خلّاقانہ نرمی اور تصوّر کی وہ معصومیّت حاصل کی جس نے ہندو کلچر میں عورت کے تصوّر کو، اُس کی دیویّت کو اور اُس کی انسانیّت کو جنم دیا۔ ہندوستان کے عشقیہ کلچر کی معراج گھر کے اُس تصوّر میں نظر آتی ہے جہاں عورت گھر کی لکشمی ہے۔ اسی سے عورت کے تصوّر میں جو ٹھنڈک اور جگمگاہٹ ہے وہ دنیا بھر کی عشقیہ شاعری میں نہیں ملتی۔ محبوب کے ایک معیاری اور عینی تصور سے اُردو کی بہترین عشقیہ شاعری یکسر محروم نہیں لیکن اُردو شاعری کے کلچری پس منظر اور کلچری روایات میں وہ نرمی، وہ پاکیزگی، وہ رچاؤ، وہ دوشیزگی اور پختگی نہیں ہے جو سنسکرت ادب کے پس منظر اور کلچری روایتوں میں نظر آتی ہے۔ جو ہندو شعراء اُردو غزل یا اُردو نظم کہنے کی طرف مائل ہوئے وہ ہندو کلچری روایات اور اُن روایات کی معنویت سے بہت کچھ بے بہرہ تھے۔ اور اگرچہ اُردو کے ہندو شعرا کے کلام میں باوجود تمام خامیوں اور خرابیوں کے ایک سنجیدگی ہمیں ضرور ملتی ہے۔ لیکن اُردو کے یہ ہندو شعراء

اُردو شاعری ہی کے کلچری پس منظر اور کلچری روایات کو اختیار کر چکے تھے اور اس لئے اُردو کی عشقیہ شاعری میں ان ہندو شعرا نے کوئی ایسی خلّاقانہ آواز نہیں بھری، جو ہزار برس سے سنسکرت ادب میں اور ایک حد تک ہندی شاعری میں گونجی ہوئی تھی۔ ورنہ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اُردو نظم و غزل میں ہندو شاعر وہ نوائے سرمدی پیدا کر دیتا کہ غالب و میر بھی چونک پڑتے۔ ہاں تو اُردو شاعری میں گھر کا تصوّر اور عورت کا تصوّر بلکہ کائنات و حیات کا تصوّر کمزور اور ناقص ہونے کے سبب سے اُردو کی عشقیہ شاعری بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر بہت کچھ کمی رکھتی ہے۔ ایک وجدانی و جمالیاتی احساس کبھی کبھی خوش نصیب لمحوں میں اُردو شاعروں کو ضرور ہاتھ آجاتا تھا لیکن مناظر قدرت مادّی اور عنصری کائنات، گھریلو اور سماجی زندگی کی جزئیات، زندگی کے بھرپور اور ٹھوس حصّوں اور پہلوؤں کو یہ وجدانی احساس بہت کم چھو پاتا ہے اور بسا اوقات ایک متصوّفانہ حال و قال کی چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس نرم معجزہ سے رابندر ناتھ ٹیگور، "پنگھٹ"

"آنگن" "گھر کے چراغ" اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات کو عشقیہ جذبات سے مملو کر دیتے ہیں۔ جو نرم پنکھڑیاں اُن کے ہر مصرع میں کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ باتیں ہندوستان کی عشقیہ شاعری کی پُرانی روایتوں کی طرف اور اُردو کی عشقیہ شاعری کے نئے امکانات کی طرف اشارے کرتی ہیں۔ گزشتہ دو تین برس کے اندر اُردو کی کچھ عشقیہ نظموں اور غزلوں میں ہندوستان کی روح سرایت کرتی ہوئی مجھے نظر آتی ہے اور اگر اُردو کی عشقیہ شاعری میں اس کیمیائی عمل کا سلسلہ جاری رہا تو اس کا بہت امکان ہے کہ رچے ہوئے دل و دماغ کے ہندو جوا بنک اُردو کی عشقیہ شاعری میں نمایاں حصّہ نہیں لے سکے تھے وہ اپنی پوری اکثریت کے ساتھ اپنے مسلمان ہمنواؤں کی آواز پر آوازیں دینے لگیں گے اور اس طرح اُردو کی عشقیہ شاعری میں ایک ایسے دَور کا آغاز ہوگا جس پر رحمت کے فرشتے سدا بہار پھول برسائیں۔

اب اُردو کی عشقیہ شاعری سے معشوق کے متعلق ایک انتقامی جذبے، مغائرت کے لہجے اور داسوخت کے انداز کا دور ختم ہو رہا ہے

امرد پرستانہ محبت بھی مستقبل کی اُردو شاعری میں کرختگی کے بجائے جیون ساتھی کا نرم تصوّر پیدا کرتی جائے گی۔ لیکن اُردو کی عشقیہ شاعری کے محرّک صرف امرد پرستانہ جذبات ہی نہ رہیں گے۔ عورتوں کا پردہ ٹھنے دیجئے، صحیح تربیت کے ساتھ مہذّب فضا میں عورتوں اور مردوں کو ملنے دیجئے، بہت سے غلط سماجی بندھن ٹوٹنے دیجئے، شادی بیاہ کے معاملہ میں اور گھر کی زندگی میں غلط داخلی اور خارجی رُکاوٹوں کو دور ہونے دیجئے جب ہم یہ کہہ سکیں گے کہ اگرچہ ہم ماضی کے نہیں ہیں لیکن ماضی ہمارا ہے۔ المیہ اور طربیہ کے بڑے تصوّرات کو ہمارے شعرا کے وجدان میں آنکھیں کھولنے دیجئے۔ اُس وقت اُردو کی نئی عشقیہ شاعری کی آواز میں وہ نرم دمک پیدا ہو جائے گی جو شبنم سے دُھلی ہوئی صبح میں ہوتی ہے اور جو گھر کی لکشمی کے ہاتھوں جلائے ہوئے گھر کے چراغ میں ہوتی ہے۔ عشقیہ شاعری کی پرکھ میں ان نازک صفات کی تلاش شامل ہے۔ اُردو کی قدیم عشقیہ شاعری کبھی کبھی اور کہیں کہیں ان صفات کی کچھ جھلک دیتی ہے، لیکن بہت کم۔ اُردو کی عشقیہ شاعری کی قدیم روایتوں سے محض بغاوت کر لینا

نئے دور کے عشقیہ شاعر کے لئے کافی نہیں ہے ۔ ہمیں جمالیات کی نئی اثباتی قدروں کو دریافت کرنا ہے اور اس کے لئے آفاقی ادب، آفاقی کلچر، تاریخ انسانی کی حیات آور روایات اور نئی تہذیب کے مطالبات سمجھ کر نئی عشقیہ شاعری کرنا ہے۔ اُردو شاعری کے نئے دَور میں بہت کچھ ہو رہا ہے اور ہو رہا ہے لیکن نئی اثباتی قدروں کو اُجاگر کرنے کا کام بہت بڑا کام ہے نئے دَور میں پُرعظمت عشقیہ شاعری بہت کم ہو سکی ہے شاید نئی تنقید اور نیا نقادانہ شعور عشقیہ شاعری کی نئی پرکھ اس کام میں ہمارے شعرا کی رنگین نوائیوں کو چمکا سکے ۔عشقیہ شاعری کی پرکھ کا سوال وہ سوال ہے جو زندگی، نفسیات، اخلاقیات، انسانی دھرم، احساس حیات وکائنات تہذیب وتمدن کی گہری جڑوں تک شاعر و نقّاد کو اور ان کی رہنمائی میں پورے سماج کو اور سماجی شعور کو لے جاتا ہے ۔

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

تاریخ کا غلط نظریہ

کیا ہندو کیا مُسلمان دونوں اکثر تاریخ کے ایک غلط اور ضرر رساں نظرئے کے شکار بن جاتے ہیں۔ یوں تو یورپ نے ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا اور ساری دنیا پر اپنا تسلّط گذشتہ سَو برس کے اندر ہی اندر قائم کیا لیکن دنیا بھر کی قافلہ سالاری اور راہنمائی یورپ کے ہاتھوں اس سے بہت پہلے آچکی تھی یعنی جب سے وہاں نشاۃ ثانیہ اور سائنس کا دَور دَورہ شروع ہوا۔ نیپولین کے سرزمین یورپ سے اُٹھ کر اُسے رَوند ڈالنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک ملک اور ایک حکومت کی بنا پر یورپ بھر میں قومیّت (Nationalism) پھبک اُٹھی۔ اس نئے جذبہ نے یا ایک پُرانے عالمگیر فطری جذبہ کے اس نئے روپ رنگ اور نئے سنگٹھن نے یورپی دیسوں کو ایک زمانے تک بہت فائدہ پہنچایا۔ انگلستان، فرانس جرمنی، اٹلی، بلجیم، ہالینڈ اور دوسرے یورپی دیسوں کا تصوّر قومیّت

کے تصوّر سے جدا کرنا گوشت سے ناخن کا جدا کرنا ہے۔

مغربی ملکوں کے ماتحت آنے کے بعد یا ان کی قربت سے یا دونوں وجوہ سے قومیت کی لہر مغرب سے مشرق کی طرف بڑھی۔ ترکستان، مصر، عرب، ایران، افغانستان، جاپان اور چین سب اس کی زد میں آگئے۔ انگلستان کی آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہندوستان قومیت زدہ بننے لگا۔ سارے جہان سے اچھا ہندوستان ہمارا اور بندے ماترم کے نغمے گھٹے ہوئے گلوں سے نکلنے لگے۔ انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ درختوں کی وجہ سے جنگل کا دیکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ قومیّت کے گھنے درختوں نے انسانیت کا ہرا بھرا بن دیکھنا ناممکن بنا دیا۔ اس کے لئے صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ اب سے قریب سینتیس[۳۷] برس پہلے جنوبی افریقہ میں جب بوئر جنگ ہو رہی تھی تو انگریز فرنگیوں کی فتح کے لئے خدا سے انگریزی میں دعا مانگتے تھے اور ہالینڈ والے ڈچ زبان میں۔ ایک انگریز بچّے نے اپنی ماں سے کہا۔ اماں خدا تو صرف انگریزی جانتا ہے وہ دشمن کی ڈچ زبان میں دعا کیسے سن سکتا ہے اور کیسے قبول کر سکتا ہے۔ بچّے کی اس نادانی پر ہندو مسلمان دونوں

ہنس پڑیں گے۔ کیونکہ معاملہ انگریزی اور ڈچ زبانوں کا ہے۔ لیکن یہی ہندو مسلمان سنسکرت کو پاک دیوبانی اور عربی کو ملیکش بھاشا یا عربی کو خاص اللہ میاں کی زبان، پاک زبان اور سنسکرت کو کفار کی زبان مشرکوں اور ناریوں کی زبان بتانے میں ایک دوسرے سے کم نہ رہیں گے اور اس انگریز بچے سے بہت بڑھ جائیں گے۔ معاملہ عربی اور سنسکرت سے گذر کر اُردو اور ہندی تک آچکا ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو مرحوم جب کلکتہ گئے تو بہت سے بنگالی مُسلمان ان کے اِرد گِرد جمع ہو گئے اور وہ ٹھیٹھ اُردو میں اُن سے سیاسی اور ملکی امور پر باتیں کرتے رہے۔ سُننے والوں کا اِنہماک بہت بڑھتا ہوا دیکھ کر اُنھوں نے پوچھا کہ آپ لوگ کچھ میری بات سمجھے بھی۔ سب نے کہا "کاہے نا ہیں سمجھے گا آپ تو رشول پاک کا بولی بول رہا ہے"۔ لیجئے اُردو "رشول پاک" یا "رشولِ اوکرم" (اکرم) کی بولی ہو گئی۔ ایک یہ بھی دلچسپ پہلو اس لطیف خیال سے نکلتا ہے کہ ہندوستان اور دنیا کی دیگر مشرک اور کافر قومیں جب اپنی اپنی زبانوں میں غیر اللہ کی عبادتیں کرتی ہوں گی تو خُدا چونکہ وہ زبانیں نہیں سمجھ سکتا وہ سزا سے بھی بچ جائیں گی اور اگر کوئی

مسلمان ہو کر ایک خُدا کی عبادت سنسکرت یا ہندی میں کرے تو خدا ان کافرانہ اور مشرکانہ زبانوں میں اپنی عبادت کی جزا بھی نہ دے سکے گا۔ چلو حساب کتاب برابر۔

ہاں تو قومیّت کی نامعقولیّت یہاں تک پہنچ چکی ہے۔ جہاں غیر مسلموں کی اکثریت آباد ہے وہ نجستان ہے۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ پاکستان ہے۔ حالانکہ ایک مچھلی بھی تالاب کو گندا کر دیتی ہے۔ ہاں قومیّت نے دنیا بھر میں تاریخ کا غلط اور ضرر رساں نظریہ پھیلا رکھا ہے۔ عرب پاک، ہندوستان ناپاک، حجازیت سب کچھ، عجمیّت عالمگیر عذاب۔ اسلامی تاریخ، خلفا اور صحابہ کے کارنامے، فتح مکّہ، فتح خیبر، واقعہ کربلا مسلمان فاتحوں اور بادشاہوں کے جنگی، سیاسی، تہذیبی کارنامے سب کچھ، باقی سب بربریّت، کُفر، مادّہ پرستی، اوہام پرستی، دہریّت، نجاست یا عیسائیت سب کچھ یا ویدک دھرم، ہندوستان میں آریئن تہذیب سب کچھ اور دُنیا بھر کی تاریخ غلاظت، یا آریوں کی خوشہ چینی یا گھٹیا نقالی، قصہ کوتاہ قومیّت نے عجیب عجیب شگوفے چھوڑے۔

رسالہ ساقی دہلی میں کچھ دنوں سے "باتیں" کے عنوان سے میں کچھ ہر ماہ کہتا سنتا رہتا ہوں۔ سنجوگ سے بات علامہ اقبال پر چل پڑی بر سبیل گفتگو کچھ اور حضرات نے بھی نومبر کے ساقی میں اظہار خیال کیا۔ اُنھوں نے مجھ سے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا کہ روس جیسی اشتراکی تہذیب کو نہ اقبال قبول کر سکتے تھے نہ کوئی مسلمان اُسے اپنا سکتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے دورِ زرّیں میں مسلمانوں کے زیر حکومت دوسری قوموں نے بھی غیر معمولی ترقی کی۔ بجا اور درست۔ تو کیا اسلام اور اقبال کی تعلیم نے ایسے فوق الانسان مسلمان افراد پیدا کر دئے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں پر ان کی حکومت قائم کر دی جائے تاکہ دوسری قومیں بھی غیر معمولی اور حیرتناک ترقی کا موقع پائیں اور اس نعمت غیر مترقبہ کے لئے سجدہ شکر کریں۔ یہ ہے قومیّت کا ایک شگوفہ کہ اچھے خاصے بھلے لوگ اس اعتقاد کے شکار ہو گئے۔ اس بسواس پر مرنے مٹنے (اور مارنے مٹانے) کے لئے تیار ہو گئے کہ مسلمان خدا کی منتخب اور محبوب قوم ہیں جو انسانی آبادی کے ایک بٹے دس حصہ ہوتے ہوئے بھی دنیا بھر کے نوّے فی صدی انسانوں پر دُنیا کی

فلاح کے لئے حکومت کریں۔ کیونکہ چھوٹے پیمانے پر پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ یہ ہے وہ صلح کل اور پیغام امن جس کے لئے ان حضرات کی خوش عقیدگی اور خوش خیالی کے مطابق اسلام نے جنم لیا ہے۔ یعنی دنیا پر جب تک مسلمانوں کی حکومت نہ ہوگی، دنیا دنیا نہ بن سکے گی۔ تہذیب و ترقی اخلاق و روحانیت علم و عمل اور ارتقائے انسانیت ایک خواب بے تعبیر رہیں گے یا بندہائے بے خبر رہیں گے تاریخ کا یہ کتنا غلط نظریہ ہے۔ اور اس سے اختلاف و منافرت کے جذبات کو کس قدر فروغ ملے گا۔

ساری دنیا قیامت تک کسی ایک مذہب کو نہ مانے گی۔ کیونکہ نیکی و بدی میں برابر کشمکش رہے گی۔ ہاں تو دنیا بھر کا ایک مذہب ہو یا کوئی مذہب یا سوامی وویکانند کے بقول دنیا بھر میں اتنے مذاہب ہو جائیں جتنے افراد ہیں یا دنیا بھر لا مذہب ہو جائے۔ یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی لیکن دنیا کا کام اٹکے گا نہیں۔ دنیا اسلامی کلچر۔ ہندو کلچر۔ بودھ کلچر۔ عیسائی کلچر۔ حجازیت اور عجمیت کے عالمگیر ہونے کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھتی رہی ہے اور بڑھتی جائے گی۔ یہ سب

کلچر انسانیت کے گرد کارواں ہیں۔

ہزاروں مشعلیں گُل کر چُکا ہے وقت کا دامن
یہ تیرا نورِ ایماں سر بسر ظلمت نہ ہو جائے

جو بات ہونے جا رہی ہے اور جو کسی کے روکے اب نہیں رُکتی وہ ہے ایک عالمگیر انقلاب :۔

اِس انقلاب کو دنیا میں عام ہونا ہے
کوئی کرے نہ کرے یہ تو کام ہونا ہے

ماضی کے بھنور سے اب انسانیت اُبھرنے والی ہے۔ ابھی ذرا ٹھہری ہوئی ہے۔ بقول یگانہ

ٹھٹھک رہے حرم و دیر کے دوراہے پر
خلاف جا نہ سکے شاہراہِ فطرت کے

اب دنیا بھر میں ہر ملک کی حکومت اُن کے ہاتھوں میں ہوگی جو تاریخ کا صحیح اور حیات آور نظریہ رکھتے ہیں۔ جو مذہب کو اس کے حال پر چھوڑ کر اشتراکیت، علوم، مشین اور ترقی کے تمام ذریعوں کو اس لئے کام میں لائیں گے کہ سو فی صدی انسانی آبادی خوشحال

اور خوش خلق ہو جائے اور مذہبی عقائد کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر علمی اور عقلی حقائق سے آنکھ لڑائے۔ انسانیت اور کائنات آنکھوں میں آنکھیں اور دل میں دل ڈال کر ایک دوسرے کے روبرو کھڑی ہوں گی:۔

ابھی فطرت سے ہونا ہے نمایاں شانِ انسانی
ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

جب کہیں جا کر تاریخ کا وہ غلط نظریہ مٹ سکے گا جس کی رو سے ہر ملک والے ہر مذہب والے اور ہر نسل والے اب تک "ہم چنیں دیگرے نیست" کا خواب دیکھا کئے۔ تہذیب کی نئی روشنی میں یہ حقیقت نمایاں ہو جائے گی کہ کوئی قوم کوئی مذہب کوئی نسل کوئی طبقہ اتنا اچھا نہیں کہ دوسروں پر حکومت کرے۔ بلکہ انسانیت اور صرف خالص انسانیت اتنی اچھی ہے کہ وہ دوسروں پر حکومت کرے۔

میری دُنیا تیری دُنیا دُنیا بٹنے کی چیز نہیں ہے

تاریخ کا صحیح نظریہ عام ہونے کے بعد ہی یہ بات سب کی سمجھ میں آجائے گی کہ اسلام، اسلام کے بعد کی اور اسلام کے پہلے کی تہذیبیں

اور کلچر اور تاریخ انسانی کا ہر اہم باب انسانیت کے اس مسلسل رجحان اس مسلسل کوشش کے گواہ ہیں جس کی مدد سے انسانیت اپنے بکھرے شیرازوں کو منسلک اور مجتمع کرتی رہی ہے۔ ہر مذہب، ہر تمدّن و تہذیب ہر قوم کی تاریخ ہر قوم کا عہدِ زرّیں ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں رہی ہیں۔ وہ زنجیر جس کا نام انسانیت ہے۔ ہند و تہذیب و تاریخ و تمدّن نے ان گنت انسانی ٹولیوں کو منسلک کیا۔ یہی بودھ تہذیب نے بھی کیا، یہی زرتشت نے بھی کیا، جدید مغربی قومیت نے بھی یہی کیا۔ صدیوں تک کئی جماعتیں متحد ہو کر دوسری جماعتوں سے ٹکراتی رہیں۔ موجودہ جنگ اسی روائتی ٹکراؤ کی ایک عالمگیر تاریخ منزل ہے۔ موجودہ عالمگیر جنگ ماضی اور مستقبل کی جنگ ہے۔

ہر مذہب و ملّت والے کبھی نسبتاً ایک بہت تنگ گروہ کے افراد تھے۔ صدیوں پہلے وہ اپنی آج کی متّحدہ ملّت کے ان اجزائے جزء مغایرت رکھتے تھے جنھیں ان کے مذہب و ملّت نے وسعت شعور دیکر آج ایک کر دیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے حلقے گھُل مِل کر بڑے بڑے حلقوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ پہلے پہل ایک چھوٹے گروہ سے ہم آہنگی کا

جذبہ جب ٹوٹ کر ایک بڑے گروہ سے ہم آہنگی کا جذبہ بنتا ہوگا تو اس وقت کے لوگوں کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔ بُدھ، موسیٰ، عیسیٰ، محمدؐ کی جو مخالفت ہوئی ان پر جو مظالم کئے گئے، صلیب، ہجرت یہ سب اسی دردِ نمو کی نشانیاں ہیں۔ ان بڑے بڑے حلقوں میں مختلف گروہ متحد ہو کر پلتے اور بڑھتے رہے۔ آج جبکہ ان حلقوں کی زنجیریں پھر چٹخ رہی ہیں تو جو جذبات و محرکات کل تک وسعت اور نشو و نما امن و اتحاد کی قوتوں کی حیثیت رکھتے تھے وہی رجعت و انحطاط کے باعث بن گئے ہیں۔ طور کی چوٹیاں موسیٰ کو بلندیوں پر بُلا رہی تھیں آج طورِ راہ کا پتھر بن گیا ہے۔ آج

راہ کھوٹی کر رہی ہے منزلِ دیریں کی یاد
کارواں سے قلب و پا کی رجعتوں کو چھین لو

حضرت عیسیٰ نے سچ کہا تھا۔ جسے زندہ رہنا ہے وہ پہلے صلیب پر چڑھے۔ اگر انسانیت کو زندہ رہنا ہے ہماری شخصیتوں کے ان حصّوں کو ان شہ رگوں کو، گوشت پوست اور ہڈی کے ان حساس حصّوں کو صلیب اور دار پر چڑھنا ہوگا جو قومیت، مذہبی ملّت و کلچر، وطنیت کے محبوب اور

خوشگوار تصوّرات سے تاریخ کے قومی محدود اور غلط نظریوں سے پیٹے ہوئے ہیں۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابندِ نے نہیں ہے

لیکن ہم کون سا رونا روئیں، وہ رونا جو اقبالؔ نے اپنا لیا تھا یعنی

ع۔ سخت دشوار ہے انساں کا مسلماں ہونا

اور جسے مغربی قومیت کی روشنی نے چمکا دیا تھا۔ اور جس کی بدولت دنیا کی قوموں میں رونے کے شغل میں بھی نفسی نفسی پڑ جائے گی۔

جہاں ہیں سینکڑوں ہنگامے تو بھی کچھ رولے

سُنائے جا یہ فسانہ بھی، کون سُنتا ہے؟

یا وہ رونا جو غالبؔ کو پسند تھا:۔

آدمی کو بھی مُیسّر نہیں انساں ہونا!

غالبؔ کے اشک گریہ سے دُھل کر ہی رخِ فرد نکھر سکے گا۔

غالبؔ پھر اِس دُنیا میں

جب مَیں اس دُنیا میں تھا تو بے چین ہو کر ایک بار مَیں نے کہا تھا:

مَوت کا ایک دن مقرّر ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آج مَوت کی گہری نیند پھر اُچٹ گئی۔ کیا نیند، کیا مَوت، دونوں میں کسی کا اعتبار نہیں۔ جب زندہ تھے تو زندگی کا رونا تھا اور مَوت کی تمنا تھی میں نے کہا تھا:۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شمع اور سحر کا کیا ذکر۔ میں نے تو کھلی کھلی بات یوں کہی ہے۔

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے　　ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہُوا

لیکن ذَوق نے اس سے بھی زیادہ لگتی ہوئی بات کہی تھی۔ وہ نہ جانے یہ شعر کیسے کہہ گئے تھے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مَر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ہاں تو میں کہاں ہوں۔ ابھی میرے حواس دُرست نہیں۔ لیکن یہ زمین

اور یہ آسمان تو کچھ جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں۔ لوگوں کو کسی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہا ہوں میں بھی انھیں کے ساتھ ہو لوں ع

"پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

اب ان راستوں پر پالکیاں جاتی ہوئی نظر نہیں آئیں۔ گھوڑوں کی گاڑیاں چل رہی ہیں۔ لیکن ان کی شکل وصورت بالکل بدلی ہوئی ہے آنکھوں کے سامنے بیسیوں ایسی گاڑیاں بھی گزر گئیں جن میں کوئی جانور جُتا ہوا نہیں تھا۔ سُن رہا ہوں کہ لوگ انھیں موٹر کار کہتے ہیں۔ ان کل پُرزوں سے چلنے والی گاڑیوں میں تیزی اور بھڑک تو بہت ہے لیکن پُرانی سواریوں کی بات ان میں کہاں۔ خیر یہ تو ہونا تھا آج سے نہ جانے کتنے برس پہلے جب میں اس دنیا میں تھا زمانہ کروٹ بدل چکا تھا۔ یہ کایا پلٹ آنکھوں کے لئے نئی چیز ہو اور دل و دماغ کو بھی حیرت میں ڈال دے لیکن میری آنکھوں نے تو اسی وقت جب پچھلی زندگی پائی تھی وہ وہ انقلاب دیکھے تھے کہ اب کیا کہوں، حیرت کیا کروں اور کس بات پر کروں۔ بچپن اور جوانی میں قلعہ کے رنگ ڈھنگ کو دیکھا تھا۔ مغل دربار کی جھلملاتی ہوئی ع

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

شمع پھر بھی ایک نیا رنگ پیدا کر رہی تھی۔ شہر کے شریفوں اور رئیسوں کی زندگیاں دیکھی تھیں۔ دُور دُور تک کا سفر گھوڑوں پر، بہلیوں پر، پالکیوں پر اور ڈاک گاڑیوں پر طے کیا تھا۔ پھر ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا، غدر کیا ہوا قیامت آگئی۔ اس کے بعد پچھلی ہی زندگی میں ریل کی سواری پر دلّی سے کلکتہ کا لمبا سفر طے کیا۔ معلوم نہیں کلکتہ کی شان اب کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہوگی۔ اُسی وقت یہ شہر دولہن بنا ہوا تھا۔ جس کی یاد سے اب بھی تڑپ اُٹھتا ہوں:۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں ایک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اور یوں تو نہ کچھ رونق میں رکھا ہے نہ اُجڑی حالت میں رکھا ہے۔ نہ صرف آبادی میں نہ ویرانے میں پھر بھی جو کچھ ہے اور جیسا کچھ ہے غنیمت ہے:۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

انسان جب زندگی کی مصیبتوں سے پریشان ہو جاتا ہے تو اُسے دُنیا

چھوڑنے کی سوجھتی ہے۔ اپنے کو دھوکا دینے اور غلط راستہ پر چلنے کو اکثر لوگ خدا کی تلاش یا سچائی کا پا جانا سمجھتے ہیں لیکن اس حقیقت کی بھی حقیقت مجھے معلوم ہے:۔

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
جب پا نہ سکے اُس کو تو آپ اپنے کو کھو آئے

دُنیا کو چھوڑ کر تو پیغمبر بھی کچھ نہیں ہوتا۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں رُوشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عُمرِ جاوداں کے لئے

میں اپنے خیالات کی دُھن میں کہاں نکل آیا۔ یہ تمام چیزیں یہ مکانات یہ آبادی نئی بھی معلوم ہوتی ہیں اور پُرانی بھی۔ اجنبی بھی اور مانوس بھی۔ وہ سامنے دُھندلکے میں لال قلعہ نظر آرہا ہے کچھ دور پر جامع مسجد کے برج اور مینار نظر آرہے ہیں۔ مَیں دلّی ہی میں ہوں۔ ہائے دلّی! وائے دلّی!!

اس بازار کی شان تو دیکھنے کی چیز ہے۔ چاندنی چوک!! اچھا یہ وہی پُرانا چاندنی چوک ہے جو بار بار اُلٹا اور بار بار آباد ہوا۔ اُجڑا اور بسا۔

اس کا نام تک نہیں بدلا۔ یہاں تو نئی زندگی کے شور و پکار میں بھی یہاں کی نئی آوازوں میں بھی پرانے نام کان میں پڑ رہے ہیں۔ کوچہ چیلان کوچہ بلّی ماران ان دو محلّوں میں برسوں میرا قیام رہا ہے۔ بہار آتی ہے اور چلی جاتی ہے لیکن باغ وہی رہتا ہے۔

اس بازار میں اُس دوسری دنیا سے پلٹ کر کیا خریدیں جب زندہ تھے تبھی یہ حال تھا کہ:۔

درم و دام اپنے پاس کہاں　　چیل کے گھونسلے میں مانس کہاں

لیکن اس طرف کچھ کتاب بیچنے والوں کی دو کانیں ہیں۔ کتابوں کی دنیا مُردوں اور زندوں دونوں کے بیچ کی دنیا ہے۔ یہاں ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ "ہم بھی اک اپنی ہَوا باندھتے ہیں" چلیں ذرا کتابوں کی اس خیالی دنیا کی سیر کریں۔ وہ ایک طرف الماری میں کوئی نہایت اچھی اور قیمتی کتاب رکھی ہوئی ہے۔ جلد تو دیکھو کیسی خوبصورت ہے۔ سُنہرے حرفوں سے کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔ اُس کے برابر چھوٹی چھوٹی کتابیں دیکھنے میں نہایت نظر فریب معلوم ہوتی ہیں "ارے بھئی ذرا یہ سامنے لگی ہوئی کتابیں تو اُٹھا

دیناد ہی جو سامنے کے تختے پر الماری میں لگی ہوئی ہیں۔ چھپائی اور سرلکھائی کے یہ کھیل پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ دیوان غالب، دیوان غالب، دیوان غالب۔ مرتع چغتائی !! میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ برکن اور ہندوستان کے کئی شہروں سے یہ کتابیں نکلی ہیں۔ کیوں بھئی ذوق اور مومن، ناسخ اور آتش، میر اور سودا یہ سب کے سب غالب سے زیادہ مشہور تھے ان کے کلام تو ادر ٹھاٹ سے چھپے ہوں گے۔ ذرا انھیں بھی دیکھوں۔ کیا کہا؟ صرف غالب کے دیوان اس اہتمام سے نکلے ہیں۔ پھر کیا کہا؟ آج غالب کے نام کا سارے ہندوستان میں شور ہے غالب پر کتابیں اور غالب پر مضامین کثرت سے نکل رہے ہیں۔ اچھا یہ کہنا بھی کسی ڈاکٹر بجنوری کا ملک میں مشہور ہے کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب۔ تو صرف رہنا سہنا ہی اس ملک کا نہیں بدلا ہے بلکہ مذاق شاعری کی بھی کایا پلٹ گئی ہے۔ ہاں اب آپ دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہوں شکریہ۔ اب میں اپنے اس شعر کو کیا کہوں۔

ہوں خفائی کے مقابل میں ظہوری غالب میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

پہلی زندگی میں دوسروں کی شہرت کے کھیل دیکھے تھے۔ مرنے کے بعد اپنی شہرت کے کھیل دیکھ رہا ہوں وہ زندگی کی ستم ظریفی تھی یہ موت کی چھیڑ ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ　　مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

اس مُرقّع چغتائی کو کیا کہوں۔ اگر میرے اشعار تصویر کے نیچے نہ لکھے ہوتے تو میں بھی ان تصویروں کو نہ سمجھتا۔ خیر تو ان لکیروں اور رنگوں سے میرے شعروں کا مطلب سمجھایا گیا ہے۔ نہ دیوان غالبؔ ہوتا نہ تصویر بنانے والا اپنا یہ کمال دکھا سکتا۔

کھُلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

بہرحال غزل کے مطلب کو تصویر کے پردوں سے ظاہر کرنے کی ادا کو میں کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا۔ زیادہ تر تصویریں بے لباس ہیں۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا

خیر اتنا تو ہوا کہ "چند تصویرِ بُتاں چند حسینوں کے خطوط" ایک جگہ کر دئے گئے۔ حسینوں کے خط یعنی ان کی شوخ طبیعت اُن کے چنچل مزاج کی وہ تصویریں جو میرے اشعار میں اکثر دکھائی دیتی ہیں اور یوں تو حسینوں کے خطوط بھی معلوم۔

قاصد کے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

خیر مشہور ہوئے تو کیا اور نہ ہوئے تو کیا۔ میرا وہ فارسی کلام جس کا ہندوستان میں جواب نہیں تھا وہ اس دوکان میں نظر نہیں آتا۔ میرے چند اشعار سے اگلے وقتوں کے لوگوں کو اور ممکن ہے آج کل کے لوگوں کو بھی یہ دھوکا ہو کہ میں نے اپنی شہرت کی ساری وجہ اپنے فارسی کلام کو جانا تھا اور اُردو کی قدر و اہمیت کو میں نہیں سمجھتا تھا۔ یہ ایک مزے دار دھوکا ہے۔ اُردو آگے بڑھ کر کیا کچھ ہونے والی تھی۔ اسی کی جھلک میں دیکھ چکا تھا۔

میرے اُردو کلام کے چند شعر جن میں فارسی زیادہ تھی ۔ لوگ لے اُڑے تھے اور یہ نہ دیکھ سکے تھے کہ میں نے اُردو غزل کو کتنی چنچل، کتنی ٹکسالی، کتنی چٹیلی، کتنی جیتی جاگتی، بولتی چالتی چیز بنا دی تھی ۔ اگر میں اُردو کی اہمیت کو نہ سمجھتا تو اپنے ان خطوط کو جن میں میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا تھا اس احتیاط اور اس اہتمام سے بچا کر نہ رکھتا ۔ قریب قریب سب سے چھوٹا اُردو دیوان میں نے چھوڑا تھا اور مجھے یقین تھا کہ سب سے زیادہ میرے ہی اشعار لوگوں کی زبان پر ہوں گے ۔

اب یہاں مجھے بہت دیر ہو چکی ۔ کتاب بیچنے والا بھی اپنے دل میں کیا کہتا ہو گا ۔ یہ ایک اخبار رکھا ہوا ہے ۔ کیوں بھئی اس پر آج ہی کی تاریخ ہے نا؟ اچھا تو آج ۲۳ر جون ۱۹۳۶ء ہے مجھے کچھ یاد آتا ہے کہ میں ۱۸۶۹ء تک زندہ تھا ۔ اس کے بعد دوسری دُنیا کی زندگی تھی اور اُس میں ماہ و سال کہاں، آج اس دنیا سے گئے ہوئے ستّر برس ہونے کو آئے ۔ اتنے بڑے عرصہ میں، میں محض اپنی شہرت اور کامیابی

کا حال جان کر خیر ایک طرح خوش ہوں ۔ لیکن یہ جاننے کے لئے
بے چین ہوں کہ ہندوستان میں اب کیسی شاعری ہو رہی ہے۔
کوئی کتب خانہ تو پاس ہوگا۔ لوگ کسی ہارڈنگ لائبریری کا پتہ
دے رہے ہیں ۔ اچھا دیکھوں یہاں کیا ہے ۔ داغ ، امیر ،
حالی ، اکبر ، اقبال ، حسرت موہانی ، جگر ، اصغر ، شاد
عظیم آبادی ، عزیز ، جوش اور دوسرے شعرا کے مجموعے
یہاں نظر آ رہے ہیں ، اُن میں داغ اور امیر کو تو میں پچھلی زندگی ہی
میں جانتا تھا ۔ حالی تو میرے سب سے ہونہار شاگردوں میں
تھے اکبر سے بیسیوں برس پہلے اس دوسری دنیا میں ملا تھا جہاں
سے خود آیا ہوں اور جہاں تمام مرے ہوئے شعرا کے ساتھ
یہ سب بزم سخن کی رونق بن گئے ہیں ۔ وہاں اکبر کا ساتھ چھوڑنے
کو تو جی نہیں چاہتا تھا اور اقبال تو ابھی ابھی وہاں پہونچے
ہیں ۔ اس شخص کی شہرت وہاں برسوں پہلے پہونچ چکی تھی اور
فرشتوں کی زبانوں پر اقبال کے نغمے برسوں پہلے سے تھے میں نے
اُردو میں جس طرح کی شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی ، شاعری کو

جو عظمت دینا چاہتا تھا۔ میری یہ کوشش اقبال ہی کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ حسرت موہانی کا کلام دیکھا۔ مومن، جرأت، مصحفی کا نام اس کلام سے چمک گیا۔ جگر، اصغر، شاد، عزیز، چکبست اور سرور جہان آبادی ان سب کی شاعری اپنی اپنی جگہ اونچی ہے لیکن کہیں کہیں روک تھام اور گہری نظر کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ دیکھوں یہ یاس یگانہ کون شخص ہے اور اس کی آیات وجدانی میں کیا ہے۔ شعر تو جاندار ہیں بیان کا طریقہ بھی کہیں کہیں اُستادانہ ہے۔ آتش کی گرما گرمی اور تیزی بھی مل جاتی ہے لیکن غالب کا نام اس شخص پر بھوت کی طرح سوار ہے۔ خیر "وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی" مرزا قتیل کی یاد تازہ ہوگئی۔ غالب نہ جانے کتنے شاعروں کی دُکھتی ہوئی رگ ہے۔ مَیں اُردو میں مسلسل نظم کی ترقی دیکھ کر خوش ہوں۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غزل ہو یا نظم سنجیدگی، مذاق کی پاکیزگی، معنی آفرینی

اور پست خیالی سے بچنا وہ خوبیاں ہیں جو شاعری کو پیغمبری کا درجہ دیتی ہیں ہاں کچھ عجیب اور غلط باتیں بھی میرے بعد کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ ایک صاحب غالب کی جانشینی کا دعویٰ یوں کرتے ہیں کہ جس طرح میر کے ستاسی برس بعد غالب کا زمانہ آیا اسی طرح غالب کے ستاسی برس بعد بھی بیوقوف دنیا پیدا ہو سکتے ہیں اپنے کچھ اچھے کچھ بُرے اشعار کو لوگ الہام بھی بتانے لگے ہیں۔ اپنی غلط اور بے ڈھنگی نقالی بھی دیکھتا ہوں بہت ہو رہی ہے۔ مہمل فارسی ترکیبیں ایک رسمی قسم کی مشکل پسندی، لفظ پرستی اور شعریت سے معرا بلند آہنگی اور اظہار علمیت یہاں تک کہ غیر موزوں کلام کو بھی شاعری بتانا یہ سب باتیں بھی آج کل کے شعراء میں آگئی ہیں۔ میں اُردو نثر اور اُردو رسالوں اور اخباروں کی کثرت اور آب و تاب دیکھ کر بھی خوش ہوں۔ رقعات غالب گویا اس بات کی پیشین گوئی تھے۔ یہ سب صحیح، لیکن دلی کی پچھلی صحبتیں یاد آگئیں اور دل کو تڑپا گئیں۔ اب نہ ذوق ہیں نہ مومن و

شیفتہ نہ حالی نہ داغ نہ مجروح نہ انور اور نہ میں۔ خیر شعر و شاعری ہی تو ساری زندگی نہیں ہے۔ مَیں دیکھ رہا ہوں کہ یہ ملک پھر بیدار ہو رہا ہے۔ اس کی تمام قوتیں مل کر ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش میں ہیں۔ اپنا شعر مجھے یاد آیا۔

ہم مُوَحِّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

میری نظریں یہ بھی دیکھ کر خوش ہیں کہ انگریزوں کی تہذیب اُن کے علم و فن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھی ہندوستان اپنی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ پھر سے چاہتا ہے۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بُزرگ ہمیں ہم سفر ملے

آم بِک رہے ہیں۔ لیکن اب اس دنیا کے آم کیا کھاؤں جن کے بارے میں میرا قول تھا کہ بس بیٹھے ہوں اور بہت سے ہوں۔ یہ تو جنّت کا پھل ہے اور وہاں کے آم سیر ہو کر کھاتا ہوں۔ اب شام ہو رہی ہے۔ مَیں صرف ایک پل کے لئے دنیا میں

میں آیا تھا۔ شاید مجھے آئے ابھی کچھ وقت نہیں ہوا اور پل مارتے میں نے یہ سب کچھ دیکھ لیا۔ دوسری دنیا کا ایک پل اس دنیا کی کئی صدیوں کے برابر ہوتا ہے۔ ہم اہلِ عدم ایک پل میں جو کچھ دیکھ لیتے ہیں دُنیا میں اُس کے لئے ایک عمر چاہئے۔ اب نہ وہ دِلّی ہے نہ ستّر برس پہلے کا زمانہ۔ نہ مرزا ہر گوپال تفتہ ہیں کہ اس بے سرد سامانی میں میری پیاس بجھائیں۔ اب تو قرض کی بھی نہیں پی سکتے۔ اخباروں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب شراب اس ملک میں بند ہونے والی ہے۔

مے بہ زاہد مکن عرض کہ ایں جوہرِ ناب
پیش ایں قوم بہ شوربائے زمزم نہ رسد

ہندوستان بہت بدل چکا ہے لیکن اگلے وقتوں کے لوگ معلوم ہوتا ہے ابھی باقی ہیں۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

خیر شراب سے نشاط اور خوشی کس کافر کو درکار ہے۔

یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے ۔ اور وہ بے خودی مجھ پر چھا چکی ہے ۔ دُنیا کے حُسن کے کرشمے دیکھ چکا ۔ میں اسی تماشہ کو قیامت کہتا ہوں ۔ مَیں خاک ہو چُکا تھا ۔

بجز پرواز نازِ شوق کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہَوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

پھر آنکھ کھُل گئی ۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
اب ہماری خبر نہیں آتی[۱]

---

[۱] بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ ۔

(باہتمام پریم چندر مہرا ۔ نیو ایرا پریس الہ آباد میں چھپا)